اوکونو ہوسو میچی

عالمی ادب کا ایک سدابہار سفرنامہ

اندرونِ شمال کا تنگ راستہ

جاپان کے عظیم شاعر اور ہائیکو کے سرخیل

متسواو بشو کی تحریر

ترجمہ

پروفیسر محمد رئیس علوی

Oku No Hoso Michi

by

Matsuo Basho

Translated by

Prof Mohammad Rais Alvi

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں۔ اس کتاب کے کسی حصے کو عُشبہ پبلشنگ انٹرنیشنل کی تحریری اجازت کے بغیر نقل کرنا یا کسی مخزن میں محفوظ کرنا منع ہے۔ یہ کتاب اس ہی صورت میں فروخت کی جائے گی کہ اس کو ناشر کی اجازت کے بغیر اس کی اصل شکل کے علاوہ کسی دوسری وضع اور جلد وغیرہ میں بطور کاروبار استعمال نہ کیا جائے اور متاخر خریدار بھی ان شرائط کے پابند ہیں۔

© عشبہ پبلشنگ انٹرنیشنل ۲۰۱۴ء

ISBN 978-969-9154-26-3

کتاب کا نام: اندرونِ شمال (صوبہ) کا تنگ راستہ

ترجمہ: پروفیسر محمد رئیس علوی

پہلا ایڈیشن : ۲۰۱۴ء

کمپوزنگ : ظفر شریف

ناشر: عُشبہ پبلشنگ انٹرنیشنل، کراچی۔ پاکستان

E-mail: ushbabooks@gmail.com

Website: www.ushba-books.com

مقابل صفحہ پر: پروفیسر سوزوکی تاکیشی اور پروفیسر محمد رئیس علوی کوہِ شرانے پر۔

انتساب

جاپان میں اردو کے باغبان

پروفیسر سوزوکی تاکیشی

کے نام جن کے ساتھ جاپان میں میں نے کئی ادبی اور تہذیبی سفر کیے اور

جو اپنے آخری سفر سے پہلے ہمیں اپنی گلی کے آخری موڑ تک رخصت کرنے آئے

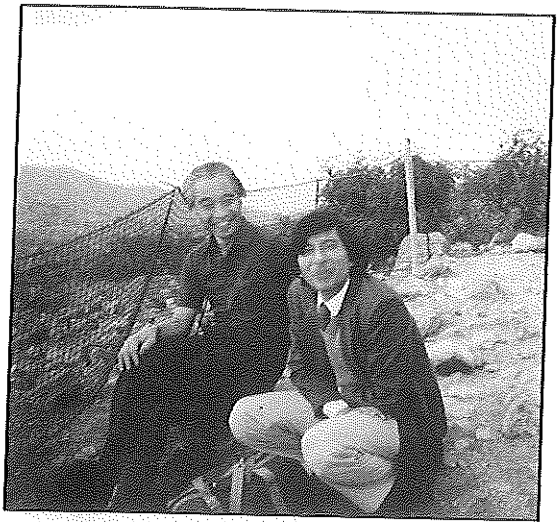

فہرست

۱۔ اوکونوکی پگڈنڈی پر	پروفیسر محمد رئیس علوی	۷
۲۔ حرفِ تعارف	پروفیسر ہیروشی ہاگیتا	۱۱
۳۔ پاکستان کے بشو	جونکو واتاسے چیمورا	۱۳
۴۔ ایک سفر کی یاد	شاشورے	۱۵
۵۔ سفر در وطن	پروفیسر محمد رئیس علوی	۱۷
۶۔ سفر کے مرحلے۔ تمہید		۲۷
۷۔ آغازِ سفر		۲۹
۸۔ حرفِ آخر		۸۷
۹۔ حوالا جات اور تشریحات		۸۹

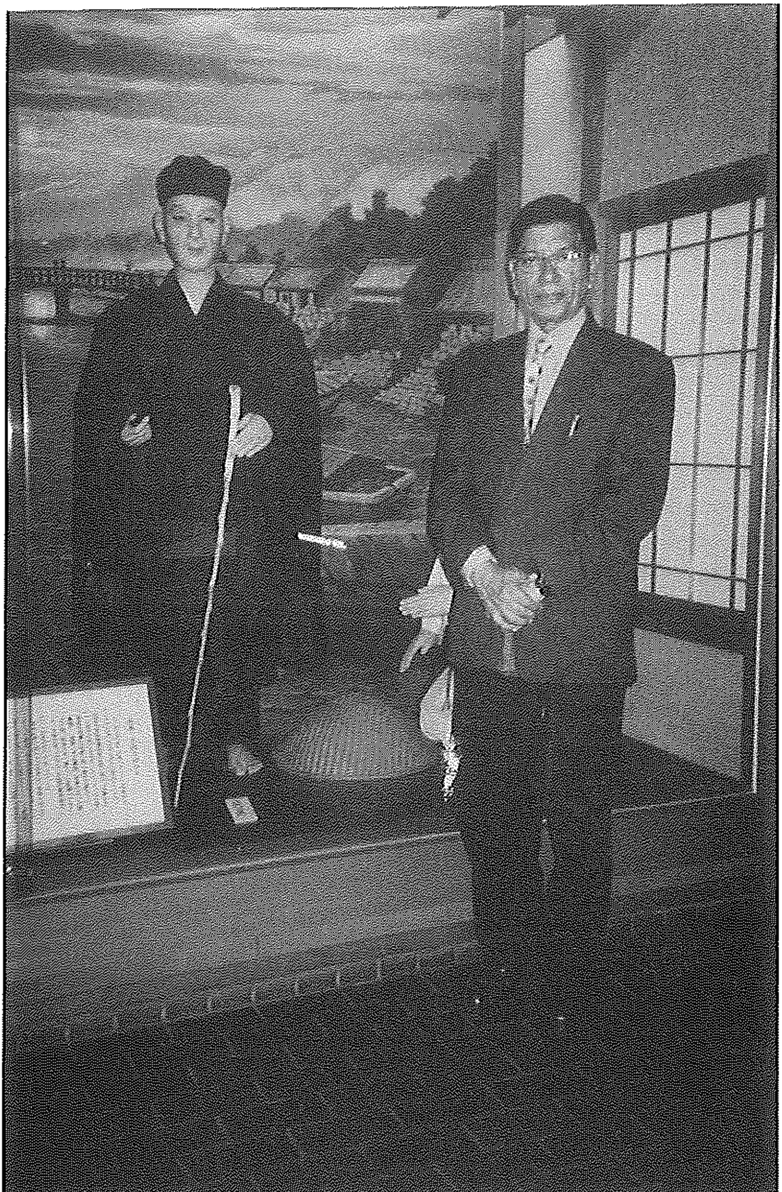

دو مسافر متسو او بشو اور پروفیسر رئیس علوی بشو میوزیم میں۔

اوکونو کی پگڈنڈی پر

اوکونو (اوکونو ہوسومیچی) کے ضمیر پر بات کرنے سے پہلے سیاحت اور سفر کے درمیان فرق سے آشنائی ضروری ہے۔ یہ دونوں اپنے آداب وانجام میں ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ انکی روش اور راحتیں بھی الگ الگ ہیں۔ سیاحت میں ایک لطف ہے، مسافرت میں کئی آزار۔ اردو زبان میں سیاحت نامے زیادہ اور سفرنامے کچھ کم لکھے گئے ہیں۔ لیکن رواروی میں ہم اکثر سیاحت ناموں کو سفرناموں کی صنف میں شمار کرتے جاتے ہیں۔

زین بدھ مت بشو کا مذہب تھا، شنتوازم ان کی قومیت تھی۔ فطرت کے ساتھ وصل انکی منزل تھی اور شاعری ان کے لئے اس تمام عالمِ وہم و وجود کا کارِ اختصار۔ بشو سیاح نہیں تھے وہ ایک مسافر تھے۔ اور ایسے مسافر تھے جو اپنا گھر بیچ کر سفر پہ نکلا تھا۔ انھیں اپنے انجام کی بھی کچھ خبر نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آغازِ سفر سے ہی مسافرت کا رنج ان کے لفظوں سے چھلکتا ہے۔

چڑیاں روتی ہیں
بہار کے جانے کا غم
مچھلی کی آنکھ نم

وہ آگے بڑھتے ہیں تو مسافرت کی اذیتیں موسم و رہگزار کے نشیب و فراز کی صورت میں انکی رفاقت کرتی نظر آتی ہے۔

اٹھاؤ آبلہ پایانِ شوق تیز قدم
کہ انتظار میں صد نوکِ خار راہ میں ہے

یوں تو سفر میں چلنے کا سارا بوجھ پاؤں پر ہوتا ہے۔ مگر قدم قدم کا حساب آنکھوں کو دینا ہے۔ بشو بھی بظاہر دیکھنے کے لئے آنکھیں کھلی رکھتے ہیں۔ مگر وہ آنکھیں بند کر کے بھی دیکھتے جاتے ہیں۔ وہ دن میں روشنی کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں مگر اندھیرے میں کوئی روشنی ان کے ساتھ چلتی ہے۔ صوفیوں اور سنتوں کے وجدان کی روشنی۔

بشو کے سفرنامہ 'اوکونو ہوسو میچی' کے ترجمہ کے دوران میں نے محسوس کیا کہ کبھی کبھی ترجمہ کا کام بھی کسی سفر کی طرح ہوتا ہے۔ اوکونو کے ترجمہ کے مراحل نے مجھے ایک لمبے سفر کے تجربے سے دوچار کیا۔ ایک دشوار اور تہہ دار سفر۔ دو سال کے عرصہ میں کئی بار رکنا پڑا اور کئی بار لفظوں کے معنوی پس منظر کی تلاش میں پلٹ پلٹ کر پیچھے کی طرف دیکھنا پڑا۔

بشو کا یہ سفرنامہ ان کے دیگر سفرناموں سے مقامات و مناظر میں مختلف ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی زبان و بیان میں بھی منفرد ہے۔ اوکونو میں ان کا طرزِ تحریر ہائیک نگاری کے اسلوب کا مثالی نثری نمونہ ہے۔ انھوں نے ہائیکو کی طرح اوکونو کی نثر میں بھی کم سخنی اور بلاغت کا شعوری اہتمام کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اوکونو کے بعض مغربی مترجمین بشو کی اِس بطرزِ ہائیک معنی آفرینی کی تہذیب سے آگہی کے باوجود اپنی معاشرتی سبک خرامی کے حوالے سے اسکی نثری تصویروں کے لفظی خدوخال کی تعبیر میں کہیں کہیں کم و بیش ہو جاتے ہیں۔ اوکونو میں معنویت جھولا جھولتی ہے۔ کبھی دور کے معنی قریب آجاتے ہیں اور کبھی قریب کے معنی دور ہو جاتے ہیں۔ بشو نے اوکونو کی نثر میں سادگی و پرکاری کا شاعرانہ کمال دِکھایا ہے۔ میر تقی میر کے شعروں کی طرح بشو کے ہاں بھی لفظوں کے تہہِ دل میں اتر کر مستور معنویت تلاش کرنی پڑتی ہے۔ اور ہمیں ہر تھوڑی دور پر تھوڑی دیر کے لئے ٹھہرنا پڑتا ہے۔ یہی ہائیکو کا بھی اسلوبِ خرام ہے۔

یہ میری خوش نصیبی ہے کہ میں نے پروفیسر سوزوکی تاکیشی، پروفیسر ہیروشی ہاگیتا، محترمہ شاشورے سان اور وتنا سے جنکو چیمو راسان کی رہنمائی اور رفاقت میں بشو کے راستہ پر بہت دور تک سفر کیا ہے۔ ہم نے اکونو کے حوالے سے یکے بعد دیگرے کئی وقفوں سے ٹوکیو، کیوتو، نارا، اوساکا، یوشینو، نِکو، اشینو، سینندائی، شی اوگاما، متسو شیما، ہیرائی زومی، سکاتا، کساکاتا، نسو، شیرانے یاما، ایگا اوانے نو اور اِی سے کے ساتھ دیگر کئی شہروں اور قصبوں کو دیکھا، وہاں ٹھیرے، لوگوں سے باتیں کیں، وہاں کے کھانے کھائے، عبادت گاہوں میں گئے، بشو کی یادگاروں اور وہاں قائم میوزیم کی تصویریں بنائیں۔ ایگا اوانے نو میں راستہ پوچھتے ہوئے بشو کے پیدائشی گھر تک گئے۔ کچھ اس طرح ہم نے بشو کی شاعرانہ زیارتوں، کی مادی اور روحانی جہتوں کو سمجھنے کی کوشش کی۔

'بشو کے تعاقب میں' جانے کا خیال پروفیسر سوزوکی کے مشورہ اور رہنمائی کا مرہونِ منت تھا۔ جاپانی ادب و شاعری کی رمزیت اور تہہ داری تک رسائی کی جستجو میں ہم نے اکونو کی پگڈنڈیوں پر بہت کچھ سیکھا اور سمیٹا ہے۔ فطرت کے ساتھ تنہائی کی طلب میں چلتے ہوئے بشو کے اس راستہ پر جاپانی فکر وطرزِ احساس کے وہ پہلو بھی ہماری آغوشِ ادراک میں آئے ہیں جو عام طور پر ادب کے کسی غیر ملکی طالب علم کے حصے میں کم آتے ہیں۔

اوکونو کا ترجمہ ختم ہوا تو 'دور شمال کا تنگ راستہ' جو مسودہ کی شکل میں تھا میں نے اپنے دوست اور ٹوکیو یونیورسٹی آف فارن اسٹڈیز میں شعبہ اردو کے چیئرمین اور پروفیسر ہیروشی ہاگیتا صاحب کی خدمت میں ارسال کیا۔ التفات کی درخواست کی۔ انھوں نے مسودہ کو نہایت توجہ اور باریک بینی سے دیکھا۔ کہیں کہیں غلطیوں کی نشاندہی کی اور مفید مشورے دیئے۔ میں نے غلطیاں درست کیں اور ان کے مشورے کی روشنی میں ترجمہ کو مستند بنانے کی سعیٔ کی۔

پروفیسر ہاگیتا کے ساتھ معروف مصنف وصحافی اور اردو غزل کی پرستار محترمہ شاشورے سان نے میری درخواست پر اوکونو کے ترجمہ کے بارے میں اپنی قیمتی آرا سے نوازا۔ میں پروفیسر ہیروشی ہاگیتا کی توجہ خصوصی و التفات کے لئے اور محترمہ شاشورے سان کا انکی

سوغاتِ تحریر کے لئے تہہِ دل سے شکر گزار ہوں۔

میری عزیز شاگرد اور جاپانی کہانیوں کا اردو میں ترجمہ کرنے والی صاحبِ کتاب ادیب وتاسے جنکو چیمو راسان نے جس خلوص سے میرے بارے میں لکھا ہے وہ ایک استاد کے لئے قابلِ فخر ہے۔ میں ان کے لئے بس یہی کہہ سکتا ہوں 'وتاسے سان آپ کا بے حد شکریہ'

پروفیسر انیتا غلام علی (سابق وزیرِ تعلیم، سندھ) اور ہم نے تعلیمی امور اور اساتذہ کے مسائل کے کسی حل کی تلاش میں ایک لمبے عرصہ تک جدو جہد کی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم ابھی تک اس سے باز نہیں آئے ہیں۔ انیتا کا شعری وادبی ذوق نہایت نفیس ہے۔ 'دور شمال کا تنگ راستہ' کو منظرِ عام پر لانے کے لئے وہ مسلسل اصرار کرتی رہیں۔ ان کی گہری دلچسپی کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ انھوں نے اِس کتاب کی طباعت واشاعت کی مکمل ذمہ داری خود ہی اٹھالی اور مجھے اس راہ کے تمام مرحلوں کے بار سے سبکدوش کر دیا۔ ان کا شکریہ ہی نہیں بلکہ ان کی عنایتوں کے لئے میں ان کا ممنونِ احسان بھی ہوں۔

میرے عزیز دوست اتاکا محمد عظمت شیگے یُوکی صاحب (سابق ایڈوائزر جاپانی کونسل جنرل کراچی) نے میری گزارش پر اوکونو کے ترجمہ 'دور شمال کا تنگ راستہ' پر اپنی محکم رائے عنایت کی۔ اتاکا صاحب آپ کی عنایت کا نہایت شکریہ۔

بیگم شاہ بانو علوی، سربراہ عشبہ پبلیشنگ انٹرنیشنل، زبان و ادب سے آشنا اور کارِ اشاعت کی باریکیوں سے پوری طرح باخبر ہیں۔ ان کے ذوق وعمل کے بغیر یہ کتاب یوں ممکن نہ تھی۔ میں 'دور شمال کا تنگ راستہ' کی اس پیش کش کے لئے انکی کاوشوں اور کمال کا دلی طور پر معترف وممنون ہوں۔

پروفیسر محمد رئیس علوی

حرفِ تعارف

جب بھی رئیس صاحب سے گفتگو کرتا ہوں مجھے محسوس ہوتا ہے کہ انہیں جاپان اور جاپانیوں سے گہری محبت ہے۔ جب وہ جاپان میں تھے تو وہ اردو کے ایک نہایت اچھے استاد بھی رہے اور جاپانی ادب کے سرگرم محقق بھی۔ اس محبت نے دو کارنامے پیدا کیے۔ ایک تو بارہویں صدی کے مشہور شاعر سئی گیو کے دیوان کا ترجمہ 'چاند کے رنگ'، دوسرا کارنامہ منیوشو کا ترجمہ 'گل صد برگ'۔ منیوشو جاپان کا قدیم ترین کلیات ہے اور اب بھی جاپانیوں میں بے حد مقبول ہے رئیس صاحب نے جاپانی ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور جاپانیوں کے مزاج اور طرز احساس سے خوب واقفیت رکھتے ہیں۔ اس لیے ان کے یہ دونوں ترجمے جاپان کی روح جاننے کے لئے نہایت اہم ہیں۔

مجھے بڑی مسرت حاصل ہوئی ہے کہ رئیس صاحب نے اوکونو ہوسومیچی کا ترجمہ مکمل کیا ہے اور اہل اردو کو جاپانی ادب کا ایک اور شاہکار پڑھنے کا موقع مل رہا ہے جب تک محبت نہ ہو تب تک ایک تہذیب کی تہ تک رسائی محال ہے۔ اس لئے مجھے پورا یقین ہے کہ رئیس صاحب کی یہ کتاب بھی جاپانی تہذیب کا جوہر جاننے کے لئے بہترین کتابوں میں ضرور شمار ہوگی۔

پروفیسر ہیروشی ہاگیتا
چیئرمین شعبہ اردو
ٹوکیو یونیورسٹی آف فارن اسٹڈیز

پاکستان کے بشو

ماتسوٗ او بشو(Matsuo Basho)جاپان کے مشہور ترین ہائیکو گو میں سے ایک ہیں۔ پروفیسر محمد رئیس علوی صاحب نے ان کے شہرۂ آفاق سفرنامہ 'اوکونو ہوسومیچی' کا اردو میں ترجمہ مکمل کیا۔ یہ کام صرف پروفیسر صاحب سے ہی ہوسکتا تھا۔

بشو نے ۱۶۸۹ء کے ماہِ مئی سے تقریباً پانچ مہینوں میں اپنے شاگرد کے ساتھ جاپان کے مختلف علاقوں کی تاریخی جگہوں کا سفر کیا۔ 'اوکونو' اس کا سفرنامہ ہے اور بشو نے اس میں بہت سے ہائیکو بھی لکھے ہیں۔

پروفیسر صاحب بہت عرصہ سے بشو اور ان کے کاموں سے دلچسپی رکھتے تھے۔ وہ قیام جاپان کے دوران 'اوکونو' میں ذکر کی گئی ہر جگہ دیکھنے کی کوشش کرتے رہے۔ یہ سچ ہے کہ ان تین سو برسوں میں زمانہ بالکل بدل گیا۔ بشو کے زمانے میں پیدل کا سفر عام تھا۔ موجودہ زمانہ میں کار، ٹرین اور ہوائی جہاز کے ذریعہ ایک جگہ سے دوسری جگہ بڑی آسانی سے پہنچ سکتے ہیں۔ عمارات اور لوگوں کے رہن سہن میں بھی فرق ہے۔ پھر بھی قدرتی مناظر میں اتنا زیادہ فرق نہیں ہے اور ویسے بھی تاریخی جگہ تو محفوظ رکھی جاتی ہے۔

پروفیسر صاحب نے ایک ایک جگہ اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی کوشش کی ہے اور وہاں بشو کے ہائیکو دل میں پڑھتے ہوئے بشو کے جذبات کو سمجھنے کی کوشش کی، وہ بالکل بشو کی طرح ایک ہی منظر کو دیکھنے، اس میں قدرت کو محسوس کرنے اور اسے تاریخ سے چھونے کی کوشش بھی کرتے۔

۱۹۹۹ء کے نومبر میں پروفیسر صاحب اپنے جاپانی شاگردوں کی دعوت پر جاپان میں تشریف لائے۔ میں بھی ان شاگردوں میں سے ایک تھی۔ وہ اس قیام کے دوران نِکّو جانا چاہتے تھے۔ اس لئے کہ بشو اپنے لمبے سفر کے شروع ہی میں نِکّو پہونچے تھے۔ اور انہوں نے 'اوکونو' میں نِکّو کی قدرتی مناظر کے بارے میں کہے گئے اپنے چند ہائیکو بھی شامل کئے تھے۔

مجھے اور انکی ایک اور شاگرد کو ان کے رہنما کی حیثیت سے ان کے ساتھ نِکّو جانے کا موقع ملا۔ ٹوکیو سے نِکّو تک ٹرین میں تقریباً ڈھائی گھنٹے کا سفر ہے۔ نِکّو پہونچنے تک ہم رہنمائی کی ذمہ داری پوری کرتے رہے۔ لیکن وہاں کے مشہور مندر 'توشوگو' (Toshogu) میں پہونچتے ہی پروفیسر صاحب ہمارے رہنما بن گئے وہ بشو کے سفر کی تفصیلات ہمیں بتانے لگے۔ توشوگو میں ایک بڑا پتھر بشو کی یادگار کے طور پر موجود ہے اس پر بشو کا ایک مشہور ہائیکو لکھا ہوا ہے۔ پروفیسر صاحب نے اس پر بھی ایک لیکچر دے دیا۔ ہم نے اس سفر میں بشو کے بارے میں بہت کچھ سیکھا۔

مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب خالی ترجمہ نہیں ہوگا۔ اس میں آپ بشو کے دل کے الفاظ پائیں گے۔ پروفیسر صاحب بشو کے جذبات کی نزاکتوں کو اچھی طرح سمجھ کر بشو کے بجائے اردو میں جاپان کی ادبی۔ تاریخی جگہوں کی تفصیلات بتاتے اور ہائیکو کہتے ہیں۔

اب آپ کے سامنے پاکستان کے بشو کا سفرنامہ تیار ہے۔ اس سے لطف اٹھایئے!

جونکو واتانابے چیمورا

(ادیب و مترجم)

ایک سفر کی یاد

آج سے کوئی پندرہ سال پہلے بشو کا تعاقب کرنے کے لیے ہم نے رئیس صاحب کے ساتھ جاپان کے شمال مغربی علاقے کا سفر کیا تھا۔ اس سفر کی یادیں اب بھی تازہ ہیں۔ جب ہم نِکّو گئے جہاں باشو نے یہ ہائیکو کہا کہ

'مندر کی عظمت / کونپل دھوپ میں ہیں دمکت / تازہ پات لگت'

اس وقت تازہ پات کا موسم نہیں تھا بلکہ پت جھڑ کے سرخ پتوں کا موسم تھا۔ رئیس صاحب نے اس نظارے سے متاثر ہو کر فرمایا۔ 'واہ، دیکھیں، کتنی خوبصورت ہے ان پتوں میں سے دھوپ کی کرنیں چھنتی ہوئی دکھائی دے رہی ہیں' جب ہم باشو کا تعاقب کر کے ٹوکیو واپس آرہے تھے تو رئیس صاحب نے پرجوش لہجے میں فرمایا تھا، 'ہم نے بشو کے نقوشِ قدم کا تعاقب کیا جس نے سئی گیو کے نقوشِ راہ کا تعاقب کیا تھا جس نے (سئی گیو) نے نوئن کے نقوش پا کا تعاقب کیا تھا'۔ اس وقت میں نے محسوس کیا کہ انسان زمان و مکان اور قومیت سے متجاوز ہو کر ایک حقیقت کو مانتے ہیں کہ

'گزرتے دن اور مہینے زمانہ کے بیچ ابدی مسافر ہیں۔ آتے جاتے سال بھی مسافر ہیں'۔

رئیس صاحب کے ساتھ جو سفر ہم نے کیا تھا وہ ناقابل فراموش ہے اور میرے لیے ایک خزانہ ہے۔

شاشورے

معروف مصنف اور صحافی

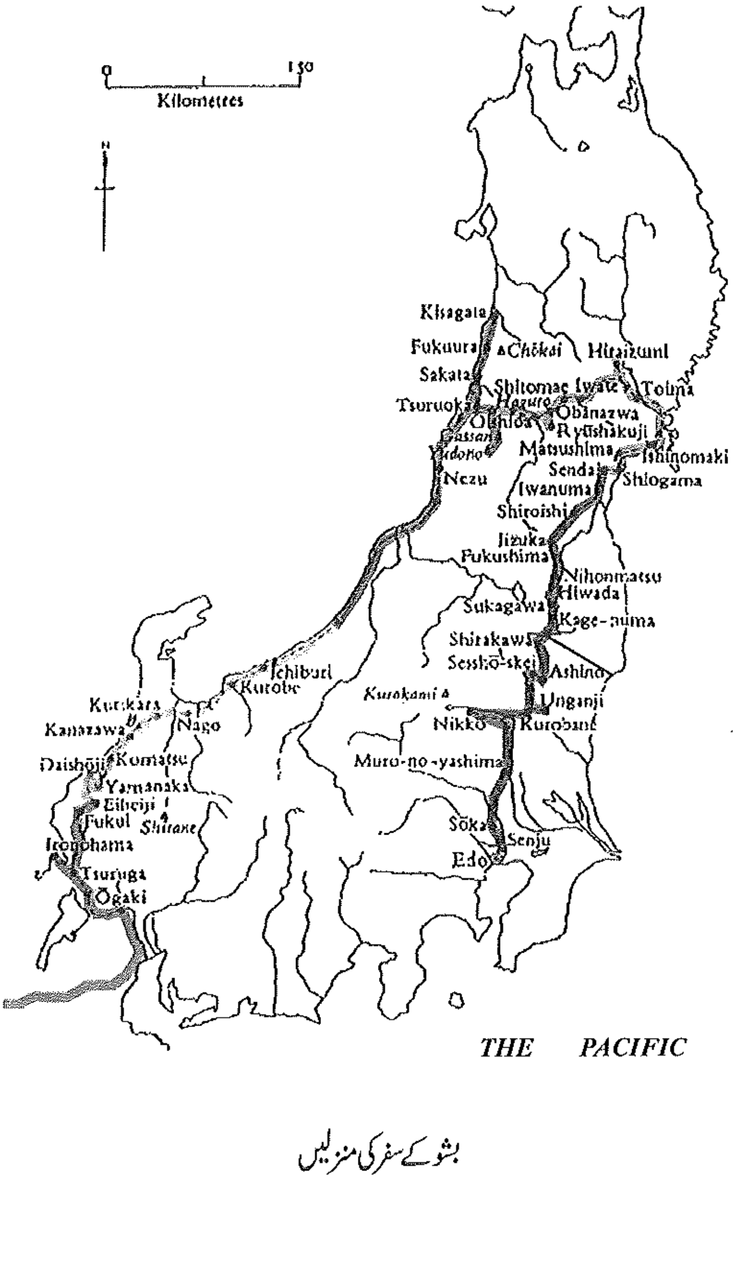

بشو کے سفر کی منزلیں

سفر در وطن

'دور اندرونِ شمال کا تنگ راستہ' کے حوالے سے

بشو کی ہائکو نگاری پر ایک نظر

سو بھی نہ تو کوئی دم دیکھ سکا اے فلک
اور تو یاں کچھ نہ تھا ایک مگر دیکھنا

خواجہ میر درد نے اپنے درج بالا شعر میں گویا بشو کی زندگی کے مرکزی کردار اضطرابِ سفر اور انبساطِ نظر کا راز لکھ دیا ہے۔ تصوف والے سالکوں کے لئے ایک مقام سے دوسرے مقام کی جانب حرکت معنوی کو سفر سے تعبیر کرتے ہیں۔ صوفیا کی اصطلاع میں بقول سید محمد ذوقی شاہ صاحب 'سالک کا طبیعت بشری میں ایک مقام سے دوسرے مقام یعنی صفات ذمیمہ سے صفاتِ حمیدہ کی طرف جانا... سفر در وطن ہے'۔

میر تقی میر نے کہا تھا:

کیا جانے بزمِ عیش کہ ساقی کی چشم دیکھ
میں صحبتِ شراب سے آگے سفر کیا

'صحبتِ شراب سے آگے کے سفر کی ابتدا بھی دیکھنے ہی سے ہوتی ہے۔ بزمِ عیش کو

دیکھا کہ چشم ساقی کو، بظاہر کیفیات دونوں کی مختلف ہیں مگر اثر دونوں کا ایک ہی ہے۔ یہاں میر صاحب جانتے ہوئے بھی بتانا نہیں چاہتے کہ اصل میں اثر کس کا تھا یا وہ اس وقت ایک ایسے عالم میں ہیں کہ اب دونوں عالموں میں امتیاز کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ مگر ایک بات ثابت ہے کہ جو کچھ ہوا وہ بس 'دیکھنے' سے ہی ہوا تھا۔ پھر تو 'دیکھنا' ہی جوازِ سفر ہے۔ یہاں قدرت وفطرت کا نظارہ اور مطالعہ دونوں 'دیکھنے' کے زمرے میں شامل ہیں۔ میر صاحب 'بزمِ عیش' یا 'چشم ساقی' کو دیکھ کر حقیقتِ وجود کی اتھاہ گہرائیوں اور بے کراں وسعتوں کا سفر کرتے ہیں۔ حجابات ظاہری اٹھنے لگتے ہیں تو درد کا یہ سخن ... 'اور تو یاں کچھ نہ تھا ایک مگر دیکھنا' صاحب نظر کی زندگی کا محور نظر آتا تھا۔ یہ دنیا دیکھنے کی جگہ ہے اگر آپ ارادے کی موج میں دیکھتے دیکھتے حقیقت تک پہنچ گئے تو ٹھیک ورنہ:

برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا

متسو او بشو زین بدھ مت کے پیروکار، شنتو عقیدے کے پرستار ہائیکو کے سرخیل اور جاپانی شعروادب کی شاہراہ پر ایک قدِ آدم سنگ میل ہیں۔ وہ ۱۶۴۴ء میں جاپان کے شہر ایگا اوا ئے نو میں پیدا ہوئے۔ ان کا شوقِ سفران کے عہد وعصر سے آگے روحِ رہگزر کا استعارہ ہے۔ وہ زندگی کو سفر اور سفر کو ڈھونڈنے اور کھونے کا بہانا جانتے تھے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ باہر کے نظارے میں کھو کر آپ اپنے اندر کچھ ڈھونڈ لیتے ہیں، کبھی اپنے اندر کی کیفیت میں ڈوب کر آپ کو باہر یا ظاہر کے منظر میں کچھ مل جاتا ہے اور کبھی آپ اپنے سے باہر کچھ دیکھ لیتے ہیں تو آپ اپنے اندر کھو جاتے ہیں:

معلوم نہیں کدھر گئے ہم

بشو اچھی طرح جانتے تھے بقول غالب:

ذرہ ذرہ ساغرِ میخانۂ نیرنگ ہے
گردش مجنوں بچشمک ہائے لیلیٰ آشنا

'اوکونو' ان کا سب سے طویل اور سب سے زیادہ جان جوکھوں کا سفر تھا۔ وہ پانچ ماہ دو دن سفر میں رہے۔ دو ہزار چار سو کلو میٹر (۲۴۰۰ کلو میٹر) پا پیادہ چلتے رہے۔ تصوّر کیجئے سترھویں صدی عیسوی کا جاپان۔ پہاڑوں اور جنگلوں سے بھرا، سمندروں سے گھرا، دشوار گزار اجنبی راستے، موسم کے بے مروت تغیرات، خطرناک ڈھلانیں، پہاڑوں کے ہمت شکن فراز، ہوشربا کگاریں اور ٹھہرنے کے بے یقین ٹھکانے۔ مگر بشو کے شوقِ سفر نے سب کو شکست دے دی۔

سفر کے ارادے کے ساتھ ہی بشو نے اپنا مکان بیچ دیا۔ مہمان خانے میں منتقل ہوئے۔ پاؤں پر ضروری مالش کی، سفر کے لئے کچھ سامان لیا (وہ بھی ان کے شانوں پر بوجھ تھا)۔ دوست دریا کے کنارے الوداع کہنے آئے۔ واپسی کے لئے کچھ نہ چھوڑا۔ لوٹ کر آنے کی کوئی آس نہ تھی، یہ آگے جانے کا سفر تھا۔ دنیا کے کارِ حرص کو ترک کرنے اور تارِ ہوس کو توڑنے کا سفر تھا۔ یہ کسی عام آدمی کا سفر نہ تھا۔ یہ ترکِ مال و اسباب دنیا کے راستے پر اوصافِ حمیدہ کی طرف جانے کا سفر تھا۔ یہی تو سفر در وطن ہے۔ یہاں حرکتِ ظاہری کے ساتھ حرکتِ معنوی بھی ہے۔ اسی وجہ سے شائد بشو نے خود اسے 'شاعرانہ زیارتوں' کا نام دیا ہے۔

بشو نے اپنے سفرنامہ میں کل اکہتر (۷۱) نظمیں شامل کی ہیں۔ ان میں سے خود بشو کی باون (۵۲)، سورا کی آٹھ (۸) سئی گیبو کی تین (۳) اور دیگر شعرا کی آٹھ (۸) نظمیں ہیں۔ سفری روزنامچہ کے نقطۂ آغاز کے طور پر بشو نے جو ہائیک لکھی وہ عربی زبان کے بے مثل شاعر امراوالقیس (انتقال ۵۳۰ء سے ۵۴۰ء کے درمیان) کی نظم 'رکو! کہ رولیں، بیاد جاناں'☆ (سبع معلقات کی پہلی نظم) کے اولین مصرعوں کی یاد دلاتی ہے۔

چڑیاں روتی ہیں
بہار کی رخصت کا غم
مچھلی کی آنکھ نم

☆نوٹ: ترجمہ اکرام جمالی

تمثیل کی نازک خیالی دیکھئے۔ تین مصرعوں میں بحروبر کو اس سادگی سے سمیٹا ہے کہ یہ دنیا ایک ماتم خانہ لگتی ہے۔ یہ بہار کے جانے پر کہرام ہے کہ بشو کی رخصت پر۔ یہاں بشو کے جاپان اور جاپان کے بشو میں کوئی فرق نہیں۔ جس طرح شیکسپیئر کے انٹونی اور کلوپیٹرا میں کلوپیٹرا نے کہا تھا، میں مر رہی ہوں، مصر مر رہا ہے (I am dying, Egypt is dying) اسی طرح اگر میں یہ کہوں کہ آپ نے بشو کو پڑھا، آپ نے جاپان کو پڑھا۔

چاند کے تیسرے مہینے کی ۲۷/ تاریخ بمطابق ۱۶ مئی ۱۶۸۹ء کو ٹوکیو سے بشو کا یہ 'اوکونو'☆ والا سفر شروع ہوا اور چاند کے نویں مہینے کی ۶/ تاریخ بمطابق ۱۱۸ کتوبر کو یہ سفر ایک اور سفر کی آرزو کے ارادے پر تمام ہوا۔ اب اِسےؔ کی درگاہ میں ہونے والی اکیس سالہ تقریب کو دیکھنے کی خواہش ہے۔

جوں خول کے باہر گھونگا
فوتامی کے لئے الوداع
میں چلا اور خزاں بھی

شمسی تقویم کے لحاظ بشو ۱۶/ مئی ۱۶۸۹ء کو ٹوکیو سے نکلے۔ نکوّ سے ہوتے ہوئے وہ نسو اور کروبانے گئے۔ شراکاوا کی سرحدی چوکی کو پار کیا۔ سوکا گاوا، کاساشیما، سینڈائی سے ہوتے ہوئے وہ سوُے نومتسو یاما پہنچے پھر شی اوگاما، متسوشیما ہیرائی زومی، اواشی دا اور موگامی سے گزر کر بشو سکاتا اور کساکاتا دیکھتے اندرونِ شمال کے راستہ پر پہنچے۔ کانازاوا، فوکوای اور تسوروگا کے تنگ راستوں کے بہت مشکل مرحلے طے کئے اور پھر ۱۸/ اکتوبر ۱۶۸۹ء کو اوگاکی نے ان کے قدم پکڑ لئے۔ ان کا یہ سفر تمام ہوا۔

☆نوٹ: اوکو جاپان کے مرکزی جزیرے ہون شو کا آخری شمالی صوبہ ہے۔ اسے اب آموری کہتے ہیں۔

بشو کا یہ سفر ایک ہائیک سے شروع ہو کر ہائیک پر ختم ہوا۔ زندگی ایک سفر ہے۔ وہ ہائیک کے تین مصرعوں کی طرح مختصر ہے۔ اور بادِ خزاں کی چاپ سن کر لرزاں پیلے پتوں کے قیام کی طرح بے ثبات ہے۔

اپنی نہایت کمال تمہید سے لیکر بشو نے اوکونو میں چھیالیس ذیلی عنوانات قائم کئے ہیں جو عام طور پر کسی مشہور مقام اور منظر کی قدیم قدرتی یا انسانی تعمیر کی طرف اشارہ ہیں۔ جنگل، پہاڑ، دریا، چاند، بارش، خزاں، باغ، بہار، شبنم، پھول، کھیت، کسان، سمندر، جھیل، ماہی گیر، شاعر، جانباز، جوگی، رسم درواج، جاڑہ، کہر، قلعہ، حویلی، گرمی، چشمہ، لباس، غذا، ساحل، ریت، ہوا۔ اوکونو میں مذکور، تمام چیزیں اور مقامات بشو کے لئے ادبی تاریخی کشش رکھتے ہیں۔

مندروں، درگاہوں، یادگاروں اور قدیم شعرا کے حوالے سے ان کا ہر بیان مستند ہونے کے ساتھ ساتھ تاریخ وادب پر ان کے گہرے مطالعہ کا ثبوت ہے۔ اوکونو میں چھیالیس ذیلی عنوانات بہت ہی معنی خیز ہیں میرا خیال ہے کہ عنوانات کی یہ تعداد اس سفر میں ان کی عمر کے گزرتے ہوئے چھیالیسویں سال کی جانب اشارہ بھی ہے۔

'اوکونو' کے واقعات ہائیک کے سفر کی کہانیاں بھی ہیں۔ بشو کے اس سفر کو علامتی طور پر ہائیک کا سفر بھی سمجھا جاتا ہے، یہ سفر بشو کے لئے فروغِ ذات اور تلاش نجات کا سفر بھی ہے۔

جاپان میں چار موسم ہوتے ہیں۔ جاپانی تہذیب وادب میں ان چار موسموں کو زندگی اور عمر کے چار مختلف مرحلوں سے استعارہ کیا جاتا ہے۔ بہار نیلی ہے کہ یہ لڑکپن اور نوجوانی کی رُت ہے۔ موسمِ گرما سرخ ہے کہ یہ شباب کی توانائی اور تیزی کا مرقع ہے۔ خزاں سفید ہے کہ اس سے بالوں میں سفیدی اور ادھیڑ عمری کی خبر ملتی ہے پھر سیاہ جاڑے کا موسم ہے جو بڑھاپے کی سختیوں، تنہائی اور موت کے انتظار کی طرف اشارہ ہے۔

بشو نے سفر کے آغاز پر 'بہار کی رخصت کا غم' لکھا تھا تو گویا نوجوانی جاتی ہے اور شباب کے دن بھی۔ اوکونو کا سفر فاصلے میں طویل اور کیفیت میں دشوار تھا تو سرخ گرمیوں کی ساری

توانائی بھی اس کی نذر ہوئی۔ پھراوکونو کی آخری ہائیک میں انہوں نے کہا 'میں چلا اور خزاں بھی' سواب جاڑوں کی یخ بستہ تاریک راتیں آنے والی ہیں۔ درد اور دکھوں کے دن اور موت کا انتظار۔ بقول فراق گورکھپوری:

پہنچ کے منزل جاناں پہ آنکھ بھر آئی

بشو درگاہوں، مندروں، خانقاہوں، حویلیوں، انکی دیواروں، سیڑھیوں، خود اور تلواروں کو دیکھتے ہیں تو وہ انہیں گزرے دنوں کی کہانیاں سنانے لگتی ہیں۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے وقت کو ٹھہرانا چاہتے ہیں کہ ان کے بنانے والوں کے چہرے تاریخ کے آئینہ سے نکال کر اپنے خیال کے آئینہ میں اس طرح لے آئیں کہ حیران قاری انھیں صاف حرکت کرتا ہوا دیکھ سکے۔

شنٹو درگاہوں میں خدا کو ڈھونڈنے اور بدھ مت کے زین مراقبہ میں خود کو کھونے والا بشو یہاں اپنی تہذیب کی تشکیل میں کام آنے والے تصورات، رسوم، روایات اور عقائد کو براہ راست دیکھنے کے لئے نکلتا ہے۔

بشو سے کئی صدی قبل وکا کے شاعر، جوگی اور پروہت نوان (۹۸۸ء سے ۱۰۵۱ء) پھر عظیم جاپانی شاعر اور پروہت سئی گیو (۱۱۱۸ء سے ۱۱۹۰ء) اور ان کی تقلید میں پھر بدھ مت کے عالم شاعر سوگی (۱۴۲۱ء سے ۱۵۰۲ء) جاپان کے شاعرانہ دیدوادید کے سفر پر نکلے تھے۔ سفر کی یہ نوعیت زندگی کو اسکی اصل حقیقت سے قریب تر دیکھنے، اس کی سادگی اور سچائی کو اپنی ذات میں سمیٹنے اور پھر فطرت کے غیر جانبدار اور بے انانیت والے کرداروں سے اس کی توثیق کرانے کی ہے۔

ہائیک لکھنے والوں کے لئے بشو کا یہ سفر نامہ ایک نصاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ جاپانی کیسے سوچتے ہیں اور جاپانی ادب کو کس طرح پڑھتے ہیں۔ یہاں ان سوالات کے جوابات ملتے ہیں۔ اس میں ہائیک لکھنے کے جواز، اس کے جمال، مواقع، مناظر، موضوعات، زبان، اسلوب، طرز فکر اور تیکنیک کے خزانے بھرے ہیں۔

کئی پہلوؤں سے بہت مختلف ہونے کے باوجود اردو میں اوکونو کی مثال خطوطِ غالب سے دی جاسکتی ہے۔ بشو نے بھی زبان کی سادگی، طرزِ تخاطب کی تازگی، بیان کی شگفتگی، جذبہ کی سچائی، دوستی اور محبتوں کا تعلق، اختصار کا جادو، علم، ادب اور تہذیب و تاریخ کے رشتوں کی ترکیب سے اس سفرنامہ کی تشکیل کی ہے۔ غالب نے بھی خطوط انہیں خطوط پر لکھے ہیں۔ اردو کی نثری تاریخ میں جو مقام خطوطِ غالب کو حاصل ہے وہی 'اوکونو' کو جاپانی ادب میں۔ غالب اور بشو دونوں شاعر تھے مگر جب انھوں نے نثر لکھنے کے لئے قلم اٹھایا تو ان کے ساتھ ان کے اپنے اپنے عہد میں نثر کے اسلوبِ جدید نے بھی اپنا قدم آگے بڑھایا۔

ہائیک میں لفظوں کی کفایت اسکی بنیادی صفات میں سے ایک ہے جس طرح اردو میں مومن خاں مومن کی غزل میں محذوفات رکھنے کا ایک خاص ذوق دیکھا جاسکتا ہے ہائیک میں یہ ایک عام دستور کے طور پر موجود ہوتا ہے۔ بشو تلمیحات سے بھی کام لیتے ہیں وہ کسی واقعہ کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں کہ جیسے قاری یقیناً ان سے واقف ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ان کے عہد میں یہ اشارے سب کے لئے قابلِ فہم ہوں مگر اب جاپانی معاشرہ بظاہر تو بہت بدلا ہوا لگتا ہے۔ بشو اپنے گھر سے رخصت ہوتے ہوئے گھر کے ایک ستون پر اپنی ہائیک آویزاں کردیتے ہیں۔

چھپر کی کٹیا
مالک بدل سکتی ہے
گڑیوں کا میلہ

بشو اپنا گھر جب سفر کے ارادے سے بیچ دیتے ہیں تو مکان خریدنے والا بشو کی طرح کوئی اکیلا آدمی نہیں تھا۔ اسکے گھر میں بچیاں بھی تھیں۔ ان کے وہاں رہنے سے گھر کی کیفیت بدل جاتی ہے۔ بشو کے شارحین کے خیال میں اس ہائیک میں بشو کا اشارہ اسی حقیقت کی طرف ہے۔

نکو کا قدرتی حسن اور اس کے تقدس کی بات کرتے ہوئے وہ اپنے عہد کے حکمرانوں کی تعریف کرتے ہیں۔ وہ ایک ہزار سال قدیم مندر کی عظمت و شوکت کے بارے میں لکھتے ہیں۔

مندر کی عظمت
کونپل دھوپ میں ہیں دمکت
تازہ پات لگت

شراکاوا کی سرحدی چوکی کے قیامت خیز حسن نے دشوار گزار راستے کی ساری تھکن کافور کردی۔ سینڈائی اور شی اوگاما میں وہ مصور کائے مون کے اعلیٰ ذوق جمال کی تعریف کرتے ہیں وہ شنتو درگاہ میں خدا کی آسمانی طاقت کا جلوہ دیکھتے ہیں۔ مستوشیما کے قدرتی حسن کی تصویر کشی میں بشو نے نثر و نظم کے درمیان امتیاز کو تقریباً مٹا دیا ہے۔

ہیرائی زومی اور اس کے بعد اوِشی دا کے بارے میں بشو بتاتے ہیں کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں سے سلسلہ بند نظموں کا آغاز ہوا تھا۔ پھر وہاں کے لوگوں کی سلسلہ بند نظموں سے محبت کا عالم کہ بقول بشو:

''یہ لوگ اس کی بہار کے دن ابھی تک نہیں بھولے ہیں۔ وہ اس شاعری کے راستہ پر ڈگمگاتے ہوئے چل رہے تھے کہ کس راستے پر جائیں نئے یا پرانے پر، انھیں رہنمائی کی ضرورت تھی۔''

تب بشو نے انھیں اپنی نظموں کا ایک مجموعہ دیا:

''کس نے سوچا تھا کہ میں اپنی شاعرانہ زیارتوں کے بیچ طرز بشو کو پھیلانے کا کام کروں گا۔''

کساکاتا کے بارے میں:

میرا دل تیز تیز دھڑکنے لگا 'اندھیرے میں ٹٹول ٹٹول کر چلنے کے ساتھ ساتھ ہمارے تصور میں تجسس سے بھرپور ایک کشش یہ بھی تھی کہ کیسا حسین منظر ہمارے اطراف میں بکھرا ہوا ہے جسے ہم دیکھ نہیں پا رہے ہیں'۔

مندر میں پروہت کے کمرے سے کساکاتا جھیل کا منظر دیکھئے:

جنوب میں لگتا تھا کہ گویا کوہِ چوکائی نے آسمان کو اوپر اٹھا رکھا ہے۔

شمال کے راستے میں جن خطرناک اور دشوار گزار مقامات کا ذکر کیا ہے وہ تاریخ کا ایک ناقابل یقین صفحہ ہے: (آج کے جاپان میں یہ سب کچھ اتنا آسان ہے کہ عقل حیران ہے)

نی گاتا کے نشاط نگر سے وابستہ خواتین کا ان مشکل زیارتوں پہ نکلنا کہ وہ اپنی بیکراں تنہائی کے دامِ نادیدہ سے شائد اسی راستہ پر چل کر نکل سکتی تھیں انھوں نے بشو سے بہ چشمِ نم ان کے پیچھے پیچھے چلنے کے لیے اجازت کی درخواست کی۔ کئی لوگوں کو شائد بشو کا جواب پسند نہ آئے کہ بشو نے ان بے سہارا اور خوفزدہ عورتوں کو نرمی سے سہی مگر واضح طور پر پیچھے چلنے سے بھی منع کر دیا۔ لیکن بشو کا یہ جواب بے مہری نہیں بلکہ جاپانی مرد کے اصولی کردار کا آئینہ دار ہے کہ جب وہ اپنے ہدف کے تعاقب میں ہے تو کوئی اور خیالِ واجبی خود اسکے تعاقب میں کیوں ہو۔

ذرا ان کے دل کا گداز بھی دیکھ لیں کا نازاوا کی روداد میں بشو اپنے ایک نہایت عزیز جواں مرگ شاگرد کی قبر پر کس طرح نوحہ کناں ہیں:

یہ خزاں کی سرد آہیں
مرادلخراش نوحہ
اے لحد کی خاک مجھ کو کوئی تو جواب دے نا

یامانا کا کے گرم پانی کے چشمے اور اپنے دوست، رفیقِ سفر سورا کی جدائی کا بیان۔ سورا نے رخصت سے قبل نظم لکھی اور بشو نے ان کے جانے کے بعد:

آج میں دھودوں گا
ٹوپی پر لکھے دو لفظ
آنسو کی شبنم

فوکوای پہنچیں گے تو آپ کی ملاقات توسائی سے ہوگی ان کی کٹیا کے اوپر چاندنی کے

پھولوں کے ساتھ لوکی کی بیل چڑھی تھی اور اندر افلاس کی ابدیت۔اس کے باوجود انھوں نے دوراتیں اپنے گھر پر بشو کی میزبانی و مدارات کی۔خزاں میں مساوی الاوقات لیل ونہار میں ماہِ کامل کا نظارہ کرنے کے لئے بشو کے ساتھ اصرار و مستعدی سے تو سائی کا نکل کھڑے ہونا قابل دید ہے۔آٹھویں قمری مہینے کی چودھویں تاریخ کو یہ دونوں تسوروگا پہنچ گئے۔مگر، شمال کا بے یقین موسم۔ تو سائی کا کردار، ان کا شوق اور جوش۔ایک کبھی نہ تھکنے والا جاپانی آپ کے سامنے ہے۔ آخر میں اوگاکی کا قیام ہے دوستوں کی محبتیں، خوشی اور ان کی خبر گیری کا ذکر۔

بشو نے ہائی کائی کو عوامی مذاق و مقابلہ اور درباری بزلہ سنجی کے عمومی دائرہ کار سے نکال کر اکیو کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے زین حقیقت شناسی کا راستہ دکھایا۔ہائیک میں شاعر اپنے جذبات کا اظہار براہ راست بہت کم کرتا ہے وہ کوئی ایسی تصویر بناتا ہے کہ شاعر کے جذبات اس تصویر کے مدمقابل آجاتے ہیں۔ہائیک کے تین مختصر مصرعوں میں کچھ کہنے سے زیادہ ان کہا چھوڑ دیا جاتا ہے اس لئے ہائیک کی معنوی گہرائی میں اترنے کے لئے تھوڑا رکنا پڑتا ہے۔

تو اب رک جاتے ہیں تھوڑی دیر کے لئے۔اور دیکھتے کہ بشو ہمیں اپنی ہائیک اور سفر نامہ کی راہ سے کن مقامات کی سیر کراتے ہیں۔

اسکو بھی دیکھنے کی طلب تھی ہزار شہر
میں بھی سفر پسند تھا چلتا تھا خواب میں

پروفیسر محمد رئیس علوی

سفر کے مرحلے

تمہید

گزرتے دن اور مہینے زمانے کے بیچ ابدی مسافر ہیں، آتے جاتے سال بھی مسافر ہیں۔ زندگی خود ایک سفر ہے۔ اور جہاں تک ان لوگوں کا تعلق ہے جو پانی پر جہازوں میں اپنے دن گزارتے ہیں اور جو گھوڑوں کو سدھانے اور تربیت دینے میں بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ کھلی سڑک ہی ان کا گھر ہوتا ہے اور یوں زمانہ قدیم کے کئی شعرا نے تو سفر کے دوران ہی رحلت کی۔

ایک دن جب ہوا کے دوش پر بے مقصد چکراتے بادلوں نے مجھ میں شوقِ آورگی پیدا کر دیا تو میں سمندر کے ساحلوں کے ساتھ ساتھ گھومنے کے سفر پر نکل گیا تھا۔ گزشتہ خزاں میں ہی دریا کے کنارے میں اپنی اس کٹیا میں واپس آیا تھا اور ابھی گھر کے جالے صاف کرنے کا کام ختم ہی ہوا تھا کہ سال گزر گیا۔

مگر جب کہر آلود فضاؤں کے ساتھ موسم بہار آیا تو خدائے حرص و ہوا نے میرے اندر شراکاوا کی سرحدی چوکی سے گزرنے کی ایک تمنا بھر دی اور خدایانِ رہگزر مجھے بلانے کے لئے اشارے کرنے لگے:

جہاں اشارۂ توفیقِ غائبانہ ملا☆

☆نوٹ: یگانہ چنگیزی کا یہ مصرعہ یہاں اضافی ہے۔

میرا دل ہر چیز سے اچاٹ ہو گیا۔ میں نے اپنے پائجاموں کی مرمت کی، اپنی ٹوپی میں نئی ڈوریاں ڈالیں اور جب اپنے گھٹنوں کی مضبوطی کے لئے ان پر موگوسا (ایک جاپانی پودے یوموگی سے تیار کردہ مقامی لیپ) کی مالش کر رہا تھا تو اس وقت میں مستوشیما پر چاند کے خواب دیکھ رہا تھا میں نے اپنا گھر فروخت کر دیا اور سمپو کے مہمان خانہ میں منتقل ہو گیا مگر اپنی کٹیا چھوڑنے سے قبل میں نے ایک نظم کہی پھر میں نے اسے ایک کاغذی پٹی (شعر لکھنے کے لئے مخصوص) پر لکھا اور گھر کے ایک ستون کے ساتھ آویزاں کر دیا۔

چھپر کی یہ کٹیا
مالک بدل سکتی ہے
گڑیوں کا میلہ

آغاز سفر

چاند کے تیسرے مہینے کی ۲۷ تاریخ (۱۶ مئی ۱۶۸۹ء) جب صبح کا آسمان کہر آلود تھا، سحر دم گل ہوتے ہوئے افسردہ چاند اور دھندلی چاندنی میں دور فوجی کی چوٹی اور قریب ہی اُواِے نو اور یانا کا میں چیری کے درختوں کی پھننگ کو اندازاً دیکھ سکتا تھا۔ کیا یہ منظر میں کبھی دوبارہ دیکھ سکوں گا؟ میں اپنی بےبسی پر حیران تھا۔

میرے قریبی دوست جو گزشتہ رات سے ہمارے ساتھ تھے، ہمیں الوداع کہنے کے لئے دریا کے کنارے کشتی تک آئے۔ ہم سنجو نامی محلّہ سے روانہ ہوئے۔ میرا دل آنے والی مسافتوں کے خیال سے بوجھل تھا۔ گو کہ یہ چند روزہ دنیا ایک دھوکے کے سوا کچھ بھی نہیں پھر بھی میں اس کی جدائی برداشت نہ کر سکا اور میری آنکھیں بھر آئیں۔

چڑیاں روتی ہیں
بہار کی رخصت کا غم
مچھلی کی آنکھ نم

میں نے اپنے سفری روزنامچہ کے ابتدائیہ کے طور پر یہ نظم لکھی اور ہم سفر پر روانہ ہو گئے مگر ہمارے پاؤں میں ایک کھنچاؤ سا تھا۔ ہماری رفتار بہت سست تھی۔ ہمارے دوست دریا کے کنارے پر کھڑے اس وقت تک ہمیں دیکھتے رہے جب تک ہم ان کی نظروں سے اوجھل نہ ہو گئے۔

ا۔ سوکا

یہ گیبن روکو کا دوسرا سال (۱۶۸۹ء) ہے۔ اچانک میرے ذہن میں شمال کے دور دراز علاقوں (اوکو) میں سفر کرنے کا خیال ابھرا۔ مجھے احساس تھا کہ لمبے اور دشوار گزار سفر میں میرے بال سفید ہو جائیں گے لیکن جن مقامات کے بارے میں میں نے صرف سن رکھا ہے انھیں اپنی آنکھوں سے دیکھوں گا۔ اگر میں زندہ لوٹ کر آ گیا تو یہ میری خوش نصیبی ہوگی۔ ایک امیدِ بے یقین پر میں نے اپنے مستقبل کو داؤں پر لگا دیا۔ بہر حال اسی دن شام کو ہم ڈاک گھر والے قصبہ سوکا پہنچ گئے۔

اس دوران میرے لئے سب سے مشکل کام اسبابِ سفر کو اپنے کمزور کاندھوں پر لے کر چلنا تھا۔ پہلے تو میں نے یہ سوچا تھا کہ صرف بدن پر موجود کپڑوں میں سفر کروں گا۔ مگر پھر مجھے رات میں سردی سے بچنے کے لیے ایک موم جامے والے کوٹ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اب ایک سوتی کیمونو، ایک برساتی اور موئے قلم جیسی چیزوں کے ساتھ وہ مختلف الوداعی تحفے بھی تھے جن سے نہ انکار ممکن تھا اور نہ ہی میں ان کو پھینک سکتا تھا۔ سو یہ وہ بوجھ تھا جسے مجھے اٹھانا تھا۔

نوٹ: جاپان میں تقویم کا حساب شہنشاہوں کے جشن جلوس کی تاریخ سے کیا جاتا ہے۔ اور ہر شہنشاہ کے دور کے لئے ایک مخصوص بامعنی نام دیا جاتا ہے جو اگلے شہنشاہ کے جشنِ جلوس تک قانونی طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

یاشیما میں ہم نے شِنتو (جاپانی مذہب) شرائن (درگاہ) کنج آتشیں کی زیارت کی۔ میرے رفیقِ سفر سوَرا نے بتایا کہ یہاں ایک دیوی 'کونو ہناسا کویاہیمے' ۳ کے ناموس کو محفوظ کیا گیا ہے۔ یہ پھول کھلانے والے درختوں کی دیوی ہے۔ کوہِ فُوجی پر بھی اس کا ناموس محفوظ ہے۔ یہ مقدس مقام 'کنج آتشیں' یا 'جلتی چھاؤں' کی عبادت گاہ کہلاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب دیوی کے دیوتا شوہر نے یہ یقین کرنے سے انکار کر دیا کہ جو بچہ دیوی کے شکم میں پروان چڑھ رہا ہے وہ ان دونوں کی صرف ایک رات کی ملاقات کا نتیجہ ہے تو دیوی نے اس دعویٰ کے ساتھ اپنے آپ کو یہاں دیوار میں چن کر آگ لگا لی کہ اگر بچہ کو کوئی نقصان نہ پہنچا تو یہ اس کی بے گناہی کا ثبوت ہوگا۔ اس سے پھر ایک بچہ پیدا ہوا جو دیوتا 'ہوہودیمی' (شعلہ آفریدن) تھا۔ اس لئے روایت ہے کہ یہاں شعر لکھتے وقت کوئی حوالہ دھویں کا رکھتے ہیں۔ یہاں اور بھی کئی روائتیں ہیں جو ابھی تک جاری نظر آتی ہیں۔ یہاں 'کونوشِروُ' ۴ نامی مچھلی نہیں کھائی جاتی کیونکہ جب یہ مچھلی بھونی جاتی ہے تو اس سے انسانی گوشت کے جلنے کی بو آتی ہے۔

۲۔ ہوتوکے گوزائی مون

تیسرے قمری مہینے کی تیسویں تاریخ ہم نے نِکو پہاڑ کے دامن میں رات بسر کی۔ سرائے کے مالک نے کہا 'لوگ مجھے بدھا صفت' (گوازئی مون) کہتے ہیں۔ میں ہر معاملے میں ایمانداری کو اولیت دیتا ہوں۔ اسی لیے لوگ مجھے اس نام سے پکارتے ہیں۔ 'آج آپ مکمل اعتماد کے ساتھ گہری نیند سو سکتے ہیں۔' ہم حیران تھے کہ اس بدکار دنیا میں کون سا اوتار انسانی روپ میں آگیا ہے جو سنتوں کے بھیس میں دو فقیر زائیروں کی دیکھ بحال کرے گا۔ ہم نے سرائے بان کو غور سے دیکھا تو وہ ہمیں فہم دنیا یا ذاتی مفاد سے مکمل بیگانہ نظر آیا۔ اور یہ کہ وہ کسی غلطی پر بھی ہٹ دھرمی کی حد تک ایماندار تھا

۔وہ کنفیوشس کے 'قوتِ کرداراور کھری دیانت' کے مثالی نمونہ سے نہایت قریب تھا۔ایسا آدمی یقیناً نہایت لائق احترام ہے۔

۴۔ نِکّو

چاند کے چوتھے مہینے کی پہلی تاریخ کو ہم نے کوہ نِکو پر عبادت کی۔ پرانے زمانے میں اس پہاڑ کا نام 'نی کو' لکھا جاتا تھا۔جو چینی کردار (الفاظ) اس کے نام کے لئے استعمال کیے جاتے تھے وہ 'دو' اور 'وحشی' کا مرکب تھے۔لیکن جب سنت کُوکائی نے یہاں ایک مندر تعمیر کیا تو انھوں نے اس کے نام میں مستعمل چینی کرداروں کو 'نکِ کو' میں بدل دیا جن کے معنی 'سورج' اور 'روشنی' ہیں ۔انھوں نے یقیناً ہزار سال بعد آنے والے حالات کی پیش بینی کی تھی کیونکہ اب تو کُوگاوا حکمرانی (۱۶۰۳ءتا ۱۸۶۸ء) کی پروقار روشنی فرش تا عرش پھیلی ہوئی ہے۔اوراس کی فیض رساں مہربان کرنیں وطن کے گوشے گوشے میں پہنچتی ہیں تاکہ عوام سلامتی اورامن کے ساتھ زندگی بسر کرسکیں۔ یہاں کی عظمت وجلال کا مجھ پر اتنا اثر تھا کہ شعر لکھنے میں جھجھک محسوس ہوئی:

مندر کی عظمت
کونپل دھوپ میں ہیں دمکت
تازہ پات لگت

'گُردکامی یاما' ('کوہ سیاہ زلف') بہار کی کہر کا ہار پہنے جاڑے کی برف سے ابھی تک سفید تھا۔ سورا نے شعر لکھا:

سر منڈوایا ہے
کوہِ سیاہ زلف نے بھی
پیراہن بدلا

سوُرا ان کا قلمی نام ہے ان کا خاندانی نام کوئی ہے اور اب وہ سوگورو کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ وہ کیلے کے ۶ درخت والی کٹیا کے قریب رہتے تھے اور روزمرہ کے گھریلو کاموں میں میری مدد کیا کرتے تھے۔ سورا مستوشیما اور کیسا کا تا کے مناظر دیکھنے کی توقع میں بہت خوش تھے۔ وہ میری ہمرہی اور راستے کی دشواریوں میں شریک ہونے کے لئے میرے ساتھ آئے تھے۔ انھوں نے سفر پر نکلنے سے قبل اپنا سر مُنڈوایا، پروہتوں کی سیاہ قبا زیب تن کی اور بدھ مت والا نام سوگو اختیار کیا۔ کوہِ کوُروکامی پر لکھی گئی ان کی نظم میں اس کا حوالہ ہے۔ 'پیراہن بدلنے' کا ٹکڑا بہت اثر آفرین ہے۔ اس کی معنویت میں گرمیوں (موسم گرما) کے لباس بدلنے کا دن اور خود سورا کا پیراہن بدلنا۔ یعنی وہ پیمانِ عقیدت جو انھوں نے سفر سے نکلنے سے پہلے کیا تھا ان سب کی طرف اشارے ملتے ہیں۔

پہاڑ پر تقریباً ایک میل اوپر ایک آبشار تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ پانی ایک غار کے دہانہ سے نکل کر ہوا میں چھلانگ لگا رہا ہے اور پھر ہزاروں چٹانوں سے گزرتا کوئی سو (۱۰۰) فٹ نیچے ایک سبز تالاب سے ٹکرا کر وہیں کھو جاتا ہے۔

اسے دیکھ کر خیال آیا کہ آبشار کا عقب سے نظارہ کرنے کے لئے غار میں جانا چاہئے کیوں کہ اس کا نام 'اُورامی نوتاکے' (عقبی نظارے کا آبشار) ہے:

لمحہ بھر کو میں
جھرنے میں اعتکاف کروں ہے
گرمی کا موسم

میں ایک آدمی سے واقف تھا جو نسوٗ ضلع میں کُروبانے (سیاہ پر) کے مقام پر رہتا تھا سو ہم نے نسُو کے جنگل سے گزرنے کا فیصلہ کیا۔ ہم نے دور پر نظر آنے والے گاؤں کی طرف جانے کے لئے ایک مختصر راستہ اختیار کیا۔ مگر گاؤں پہنچنے سے قبل ہی بارش شروع ہوگئی۔ اور رات سر پر آگئی۔ تو ہم ایک کسان کے گھر پر ٹھہر گئے اور رات وہیں گزاری۔ اگلی صبح پھر ہم جنگل پار کرنے کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔

ہم نے ایک گھوڑے کو چرتے ہوئے دیکھا اس کے قریب ہی ایک آدمی گھاس کاٹ رہا تھا۔ ہم نے اس سے گاؤں کا راستہ پوچھا۔ گو کہ وہ ایک دیہاتی آدمی تھا مگر اس میں مہربانی کا جذبہ تھا۔ اس جنگل میں پیچیدہ راستے ہیں۔ آدمی آسانی سے راستہ بھٹک سکتا ہے۔ میرا گھوڑا لے جاؤ اور جہاں تک جائے وہاں تک لے جاؤ اور جب یہ رک جائے تو اسے واپس بھیج دینا۔

ہم گھوڑے پر سوار ہوئے ابھی چلے ہی تھے کہ دو بچے ہمارے پیچھے دوڑتے ہوئے آئے۔ ان میں ایک لڑکی تھی جس نے اپنا نام 'کسانے' بتایا جس کے معنی ہیں 'تہہ دار' یہ اتنا غیر معمولی اور خوبصورت نام تھا کہ سورا نے اس پر درج ذیل نظم کہی:

وہ رخسار گلابی ۸
تہہ در تہہ اک پھول کھلا
کس نے نام دیا

چھوٹے سے اس گاؤں میں پہنچنے سے بہت پہلے ہم نے گھوڑے کی زین سے کچھ رقم باندھ کر اسے واپسی کے راستے پر چھوڑ دیا۔

۴۔ کُروبانے

وہاں ہم ایک صاحب کے گھر گئے جن کا نام جو بو جی تھا۔ یہ صاحب نواب کُروبانے کے قلعدار تھے۔ وہ ہمارے اچانک پہنچنے سے بہت خوش ہوئے۔ ہم تمام دن اور پھر تقریباً ساری رات باتیں کرتے رہے۔ ان کے چھوٹے بھائی توسُوی عقیدت سے بار بار ہمارے پاس آتے رہے اور انھوں نے ہمیں اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ ان کے دیگر رشتے داروں نے بھی جن سے انھوں نے ملایا تھا ہمیں اپنے گھر بلایا۔

وہاں کے قیام کے دوران ہم نے شہر کے مضافات کی بھی سیر کی۔ ہم نے چاند ماری کے اس میدان کے آثار بھی دیکھے جہاں زمانہءِ قدیم میں لوگ کند تیروں سے بھاگتے ہوئے کتوں پر تیراندازی کی مشق کرتے تھے۔

بانسواڑی کے جنگل سے گزر کر ہم نے خانم تماموکے پرانے مقبرے کی زیارت کی۔ وہاں سے ہم جنگ کے دیوتا سے منسوب ہچی مان کی درگاہ عبادت کے لئے گئے۔ جب میں نے سنا کہ یہ وہی درگاہ ہے جہاں نَسُو کے یواِچی نے دشمن کی آگے بڑھتی ہوئی کشتی کے پنکھے کا نشانہ لیکر آخری تیر چلاتے ہوئے دیوتا کو پکارا تھا ' ہچی مان، اے ہمارے وطن کے نگہبان دیوتا'، تو میرا دل تیزی دھڑکنے لگا۔ اب اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ ہم توسُوئی کے گھر واپس آگئے۔

یہاں بدھ مت کا ایک مندر تھا جس کا نام میو جی تھا۔ ہمیں وہاں مدعو کیا گیا۔ ہم نے اس مندر کے بانی کی مورتی اور ان کے نام ۹ سے منسوب ایک مخصوص جگہ پر رکھے ہوئے لکڑی کے اونچے کھڑاؤں کے سامنے عبادت کی۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے یہی کھڑاؤں پہنے پہنے اور بدھ مت کی تبلیغ کرتے ہوئے ان پہاڑیوں کو عبور کیا تھا۔

گرمی کا کہسار
کھڑاؤں کو تعظیم دی
سفر کا آغاز

۵۔ اُنگا نجی

گُروبانے سے تھوڑی دور اُنگا نجی (مندر) کے عقب میں بنی خانقاہ میں میرے زین مرشد بُوچو ۱۰ نے مراقبہ کیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ انھوں نے بتایا تھا کہ درج ذیل نظم صنوبر کے کوئلے سے یہاں چٹان پر انھوں نے لکھی تھی:

بدن سمیٹوں کیسے؟
پانچ فٹ چوڑا
کچھ پانچ فٹ اونچا
چھوٹا سا حجرہ
بارش نہ ہو، کیا
کٹیا کی حاجت

یہ دیکھنے کے لئے کہ اب بھی اس کٹیا کے آثار باقی ہیں یا نہیں میں نے اپنی لاٹھی 'ان گنجی' کی طرف موڑ دی۔ گُروبانے سے کئی دوست بھی ہمارے ساتھ ہو لئے تھے۔ ان میں کچھ نوجوان تھے راستہ ہنسی مذاق میں ایسے گزر گیا کہ پتہ ہی نہیں چلا اور ہم پہاڑ کے نیچے پہنچ گئے۔ وادی سے اوپر کی طرف شمشاد و صنوبر کے گھنے جنگل کے درمیان جاتا ہوا ایک راستہ

درختوں میں کھو گیا تھا۔ شبنم کے قطرے صنوبر کے گھنے جھنڈ سے گر رہے تھے۔ گرمیوں کا آغاز ہو چکا تھا مگر ہوا ٹھنڈی تھی۔ ایک خوشنما راستہ کا سرا جسے 'دس نظارہ' کہتے ہیں، ہم نے دیکھا اور وہاں سے گزر کر ہم نے ایک پل پار کیا اور مندر کے دو در جاتی پھاٹک میں داخل ہو گئے۔

ہماری حیرت زدہ نظریں بُوچو کی خانقاہ کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ ہم مندر کی پشت پر ایک پہاڑی پر چڑھے تو ہم نے دیکھا کہ چٹان کے اوپر ایک بہت تنگ سے غار کے آگے ایک چھوٹی سی جھونپڑی بنی ہے (یہ بُوچو کی خانقاہ تھی)۔ یہ منظر بالکل ایسا ہی تھا جیسے چین میں 'موت کے دروازے' والا 'یوآن میاؤ' کا غار یا چٹان کی چوٹی پر بنا فایوُن کا حجرۂ اعتکاف:

دیکھو کھٹ بڑھئی
کٹیا کو نقصان نہ ہو
گرمی کی وادی

میں نے فی البدیہہ یہ نظم لکھ کر جھونپڑی کے ایک ستون کے ساتھ لٹکا دی۔

۷۔ سِیشوسیکی یا 'سنگ ذبح'

ہم کروبانے واپس آ گئے اور پھر وہاں سے نَسُو کے 'سنگِ ذبح' کو دیکھنے گئے۔ روایت ہے کہ جب خانم تماموکے بارے میں جو شہنشاہ کونوا ے کی محبوبہ تھی یہ پتہ چلا کہ وہ انسانی روپ میں ایک لومڑی ہے تو اسے قتل کر دیا گیا مگر اس کی لومڑی روح نے خود کو اس فاسد پتھر میں بدل لیا۔

میرے دوست جو بوجی صاحب نے ہمیں گھوڑے بھی مستعار دیئے تھے کہ ہم اچھی طرح گھوم پھر سکیں۔ میرے گھوڑے کے لگام دار نے مجھ سے ایک نظم کی درخواست کی۔ میں نے سوچا کہ ایک اصطبل میں کام کرنے والے کی طرف سے یہ ایک نہایت فنکارانہ خواہش کا اظہار

ہے۔ میں نے اس کے لئے درج ذیل نظم لکھی:

گھوڑے کو موڑ
میں سنتا ہوں جنگل میں
کوئل کی کوکو

سنگِ ذبح ایک اونچے مقام پر اب بھی موجود ہے جس کے قریب ہی گرم پانی کا چشمہ ابلتا ہے۔ اس پتھر سے ابتک ایسے زہریلے بخارات نکلتے ہیں کہ مکھیوں اور پتنگوں کا ایک ڈھیر اس کے اوپر تھا۔ جس کی وجہ سے زمین کا اصل رنگ نظر نہیں آرہا تھا۔

۷۔ آشینو میں سئی گیو کا بیدِ مجنوں

شاعر سئی گیو کا گریہ کناں یہ بیدِ مجنوں کا درخت آشینو گاؤں کے قریب بہتے ہوئے ایک شفاف چشمہ کے پہلو میں دھان کے کھیتوں کے درمیان ایک پگڈنڈی کے ساتھ کھڑا ہے۔ آشینو کے جاگیردار نے کئی بار مجھ سے کہا کہ میں درخت دیکھنے کے لئے چلوں سو آج واقعی میں اس درخت کی چھاؤں میں کھڑا تھا:

دھان کی پنیری
کھیت میں جب تک جمتی
میں کھڑا رہا چھاؤں میں اس کی

۸۔ شِرا کا وا کی سرحدی چوکی

جب شِرا کا وا کی سرحدی چوکی پر پہونچے تب جا کر ہمیں اطمینان ہوا کہ آخر کار ہم اپنے صحیح راستہ پر ہیں اور اب یہ بات اچھی طرح میری سمجھ میں آئی کہ گزرے دنوں کے مسافر شاعر تائرا نو کیمو ری نے یہ کیوں محسوس کیا تھا کہ 'کسی طرح بھی دار الحکومت کے لوگوں تک' وہ اپنا پیغام پہنچائے۔

شِرا کا وا کی سرحدی چوکی شمال میں ان تین مشہور سرحدی چوکیوں میں ایک خاص حیثیت رکھتی ہے جو شعرا کے لئے ہمیشہ پر کشش رہی ہیں۔ مجھے گرمیوں کی ہریالی میں درخت اچھے لگتے ہیں۔ اگرچہ میں شاعر نو اِن کے 'خرامِ بادِ خزاں' کو سن سکتا تھا اور منا موتو یو ریماسا کی 'میپل کی قرمزی پتیوں' کو دیکھ سکتا تھا مگر اب برف کے پھولوں کی سفید پوشاک اور خودرو جنگلی سفید گلابوں نے مجھے ان شعرائے قدیم کی یاد دلائی جو برف سے ڈھکے موسموں میں یہاں سے گزرے تھے۔

ایک قدیم ہیرو کیوِ سوٗ کے لکھتا ہے کہ اس سرحدی چوکی سے گزرتے ہوئے اس نے اپنے خود کو ٹھیک کیا اور نئی پوشاک پہنی۔[۱۲]

پھول کو شاخ کے ساتھ
ٹوپی میں یوں لگائیں
آن بان سے جائیں

۹۔ سُو کا گا وا

چوکی سے گزر کر ہم نے ابو کُما دریا پار کیا۔ اب ہمارے بائیں جانب آئزُو کے علاقے میں بندائی پہاڑ کی اونچی چوٹی کھڑی تھی۔ اور ہماری دائیں طرف اِوا کی، سوما اور مہارُو کے علاقے پھیلے ہوئے

تھے۔ اور اسی رخ پر وہ پہاڑی سلسلہ تھا جوان کو ہتیاچی اور شموتسو کے سے الگ کرتا تھا۔ راستے میں ہم ایک ایسے علاقہ سے گزرے جسے 'کا گےنُما' (درپن تال) کہا جاتا ہے۔ مگر اس دن آسمان ابر آلود تھا اور انعکاس کا نظارہ میسر نہیں تھا۔

سُوکاگاوا کے سرحدی قصبہ میں ہم شاعر توکیوُ سے ملنے گئے۔ انہوں نے اصرار کیا کہ ہم چار پانچ روز ان کے ساتھ گزاریں۔ پہلی بات جو انہوں نے مجھ سے پوچھی وہ شرا کاوا چوکی سے متعلق میرے شاعرانہ تاثر کے بارے میں تھی۔

میں نے جواب دیا کہ طویل سفر کی تھکن کے بعد بھی جبکہ میں جسمانی اور ذہنی اعتبار سے شکستہ تھا اس منظر کے حسن کو دیکھ کر ششدر رہ گیا تھا۔ پرانے زمانے کے گیتوں کے خیال سے میرے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ مگر میں شعر کہنے کی طرف بہت کم مائل ہوا۔ میں نے توکیوُ کو بتایا کہ یہ بھی ایک افسوس کی بات ہوتی کہ میں چوکی سے بے کچھ کہے گزر جاؤں تو میں نے یہ نظم لکھی:

شعر کا ہے آغاز
بوائی کے وقت کسانوں کے
گیتوں کی آواز

بس یہی کچھ لکھا تھا۔ بہر حال یہ بہت مشکل تھا کہ میں کوئی شعر کہے بغیر اس سرحدی چوکی کو پار کر جاؤں میرے ان تین مصرعوں کو مکھڑا بنا کر ہم نے تین سلسلہ بند نظمیں لکھیں۔

اس سرحدی قصبہ سے کچھ دور شاہ بلوط کے ایک بڑے درخت کی چھاؤں میں ایک سادھو دنیاوی آسائشوں سے دور گوشہ نشینی میں رہتا تھا۔ اس کی کٹیا کی پُرسکون فضا نے مجھے سئی گیو کی نظم یاد دلائی:

ٹیلوں کے بیچ، صاف
ٹھنڈا پانی پینے دو
پربت کا سوتا
شاہ بلوط کے پھل چنتے ہیں
چاروں اور جو بکھرے ہیں

شاہ بلوط کے لفظ کی لکھائی میں جو چینی کردار استعمال ہوتے ہیں ان کے معنی ہیں 'مغرب کا درخت' لوگ کہتے ہیں کہ شاہ بلوط کا درخت مغرب میں 'فردوسِ بدھا' سے کوئی تعلق رکھتا ہے۔سنت گیوکی نے تمام عمر شاہ بلوط کی لاٹھی استعمال کی ان کے گھر کے ستون بھی شاہ بلوط کی لکڑی کے تھے:

دنیا والوں نے
شاہ بلوط کے پھول نہ دیکھے
چھجے پر بکھرے

۱۰۔ اَساکا کی دلدل

توکیو صاحب کے گھر سے صرف بارہ میل کے فاصلے پر، ہیمُو ادا نامی گاؤں تھا۔قریب ہی سڑک کے پاس اَساکا کی پہاڑیاں کھڑی تھیں۔ وہاں کی زمین بہت دلدلی تھی۔ان دنوں گُل سوسن جمع کرنے کا موسم قریب تھا ہم نے کئی لوگوں سے پوچھا کہ کتسُومی کا درخت کون سا ہے۔لیکن ایسا لگا کہ کسی کو بھی معلوم نہیں تھا۔(جب شاعر فُوجیوَارانوسانیکاتا[۱۲] کو یہاں جلاوطن کیا گیا تھا تو انہوں

نے سوسن میلہ کے موقع پر کنشُومی سے کام لیا تھا)۔ ہم دلدل کی اطراف میں اسے ڈھونڈتے رہے اور تلاش کے دوران بار بار لوگوں سے پوچھنے کے لئے کنشُومی کنشُومی دوہراتے جاتے کہ سورج مغرب میں پہاڑوں کے پیچھے ڈوب گیا۔

سیدھے ہاتھ پر جڑواں صنوبر کی طرف جاتے ہوئے تھوڑی سی دیر کو ہم گورودُو کا غار کو دیکھنے کے لئے ٹھہرے اور پھر فوکوُشیما کی طرف نکل گئے۔ جہاں ہم نے رات بسر کی۔

۱۱۔ شِینو بوُ کا نقشین پتھر

اگلے دن اس پتھر کو دیکھنے ہم شِینو بوگاؤں گئے۔ پتھر پر قدرتی طور پر نقش ونگار بنے ہوئے تھے۔ پرانے زمانے میں لوگ اس کے ابھرے ہوئے نقوش پر ناٹ یا کسی جھاڑی کے پتوں کو رگڑ کر کپڑوں کے لئے ڈیزائن بناتے تھے۔ دور ایک پہاڑی کے نیچے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ہمیں وہ پتھر ملا جو آدھا زمین میں دھنسا ہوا تھا۔ گاؤں کے بچوں نے ہمیں بتایا کہ یہ پتھر پہلے پہاڑ کی چوٹی پر رکھا تھا لیکن جو لوگ اسے دیکھنے کے لئے جاتے وہ ڈیزائن بنانے کے لئے اس پر اپنے ہاتھ رگڑتے اور بار بار اسے اسکی جگہ سے ہٹاتے تھے۔ اس بات پر یہاں کے کسان اتنا ناراض ہوئے کہ انھوں نے پتھر کو اس جگہ سے ہٹا کر نیچے وادی میں لڑھکا دیا۔ بچوں نے یہ بھی بتایا کہ اب یہ پتھر منہ کے بل الٹا پڑا ہے۔ ان کی کہانی میں شائد بہت حد تک سچائی تھی۔

وہ ہاتھ پنیری جماتے
پنجوں پہ رنگ لگاتے
پتھر سے نقش اٹھاتے

۱۱۔ ساتو۔ مارُویاما قلعہ کے آثار

ٹسو کی نووا (چاند کا حلقہ) نامی کشتی سے دریا پار کر کے ہم سے نواُوئے (دھارے سے اوپر) قصبہ میں پہنچے۔ ہمیں بتایا گیا کہ ساتو قلعہ کے کھنڈرات ہماری بائیں جانب والی پہاڑیوں کے قریب کوئی ساڑھے تین میل کے فاصلے پر ہیں۔ ہمیں اِزوکا گاؤں کے پاس سبا کے جنگل کی طرف جانے کو کہا گیا۔ جب ہم راستہ پوچھتے پوچھتے اس طرف جا رہے تھے تو ہم مارُویاما (گول پہاڑ) کے مقام پر آ گئے۔ یہی وہ پہاڑ ہے جس پر کبھی مشہور جنگجوؤں کا وہ قلعہ کھڑا تھا۔ پھر ہم پہاڑ کی دوسری طرف نیچے اُترے جہاں قلعہ کے عظیم الشان پھاٹک کی بنیادیں دیکھ کر ہماری آنکھ بھر آئی۔

قریب ہی ایک مندر میں ساتو خاندان کی تربتوں کے پتھر موجود تھے۔ میں خاص طور پر ساتو برادران کی دو جوان بیویوں کی قبروں سے متاثر ہوا۔ انہوں نے اپنی ساس کی خوشی کے لئے اپنے اپنے شوہروں کے بھاری زرہ بکتر پہنے تھے۔ کیونکہ ان کی ساس اپنے بیٹوں کو جنگ کے بعد فاتح کی حیثیت سے واپس آتے دیکھنا چاہتی تھیں۔ ان دونوں شوہر پرست خواتین کے دلیرانہ اقدام کبھی بھلائے نہیں جا سکتے۔ ان کی یاد سے میری آستین بھیگ گئی۔ کسی کو گنبد گریہ دیکھنے کے لئے چین کے دور دراز سفر کی ضرورت نہیں۔ کون ہے جو یہاں اس پتھر کے سامنے ضبط گریہ کر سکتا ہے اور آنسوؤں کو آنکھوں سے باہر جانے سے روک سکتا ہے۔

ہم مندر میں داخل ہوئے تو ہم نے چائے کی فرمائش کر دی۔ ذخیرۂ نوادرات میں یوشتسونے کی تلوار اور بید مجنوں کی پتلی شاخوں سے بنا ہوا وہ سفری تھیلا تھا جسکو یوشتسونے کا رفیقِ عزیز بینکئی اپنی پیٹھ پر لیکر اسکے ہمراہ چلتا تھا:

سب شان و شوکت
پٹی، تیغ، کاغذی مچھلی
بچوں کا میلہ۔ ۱۴

میں نے یہ نظم لکھی کہ آج چاند کی پہلی تاریخ (پانچواں قمری مہینہ) تھی۔ اور یوم اطفال کا میلہ قریب تھا۔

۱۲۔ اِی زُوکا

وہ رات ہم نے اِیزُوکا میں بسر کی۔ وہاں گرم پانی کے چشمے تھے۔ ہم ان میں نہائے اور قیام کے لئے ایک سرائے میں آ گئے۔ مگر وہاں کچے فرش پر چٹائی بچھی تھی وہ ایک بیکار گندی سی جگہ تھی۔ وہاں کوئی چراغ بھی نہ تھا۔ ہم نے سونے کے لئے ایک اونچی جگہ کا انتخاب کیا جہاں آتش دان کی کچھ روشنی تھی۔ ہم لیٹ گئے۔

اس رات وہاں گرج چمک کے ساتھ تیز بارش ہو رہی تھی۔ اور چھت ٹھیک اسی جگہ سے ٹپک رہی تھی جس کے نیچے ہم لیٹے تھے۔ پتنگوں اور مچھروں کا نہ پوچھئے۔ سونا محال تھا۔ اور اس پر سونے پر سہاگہ یہ کہ میری پرانی تکلیف دوبارہ شروع ہو گئی اور میں واقعی یہ سوچنے لگا کہ میں عنقریب مرنے والا ہوں۔

جب گرمیوں کی یہ چھوٹی رات آخر ختم ہوئی اور روشنی پھیل گئی تو ہم نے اپنا سفر دوبارہ شروع کیا۔ مگر رات کا کرب ابھی تک باقی تھا اور میرا جوش ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔

ہم نے گھوڑے کرائے پر لئے اور کوری جانے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ یہ سوچ کر کہ ابھی ایک لمبا راستہ طے کرنا باقی ہے میرے دل میں یہ وسوسہ پیدا ہوا کہ کہیں میں دوبارہ بیمار نہ پڑ جاؤں۔ پھر بھی دور افتادہ مقامات کے اس سفر میں اگر عام راستہ سے ہٹ کر میں مر جاؤں تو! مگر میں ابتدا ہی سے انسانی وجود کے عدم سے بے تعلق تھا۔ اگر کسی پہاڑی راستہ کی کگار سے میں ایک فقیر کی طرح گر کر مر جاؤں تو یہ میرا مقدر ہوگا۔ یہ سوچ کر رفتہ رفتہ میرا حوصلہ واپس آیا۔ اور میں

زمین پر قدم جما کر عزم کے ساتھ چلنے کے قابل ہوا اور ہم داتے کے عظیم پھاٹک سے ہنستے کھیلتے خوش باش گزر گئے۔

۱۴۔ کا سا شیما

اَبُومیزُ وری اور شیر واشی کے قلعہ بند قصبوں سے گزر کر ہم کا سا شیما کے علاقہ میں داخل ہوئے۔ ہم نے وہاں لوگوں سے پوچھا کہ دسویں صدی عیسوی کے شاعر اور شاہی محافظ دستہ کے جنرل فُوجیوارا نو سانیکا تا کی قبر کہاں ہے؟ ہمیں بتایا گیا کہ یہاں سے کافی دور سیدھے ہاتھ پر پہاڑیوں کے دامن میں مینِو ا اور کا سا شیما کے گاؤں ہیں۔ وہاں ہمیں خدائے رہگزر (راستہ کے دیوتا) کی درگاہ ملے گی۔ اس کے سامنے سانیکا تا گھوڑے سے نہ اترا تھا۔ نتیجہ کے طور پر اسی جگہ وہ ہلاکت خیز حالت میں گھوڑے سے گرا تھا اور وہیں اس کی قبر ہے۔ سئی گیو نے لکھا تھا 'اس کی واحد یادگار' اونچی اونچی گھاس ابھی تک وہاں اگتی ہے۔ حالیہ بارشوں کی وجہ سے راستہ بہت خراب تھا اور میں بہت تھکا ہوا تھا اس لئے ہم نے بس دور سے گزرتے ہوئے درگاہ اور قبر کو دیکھا۔

ابتدائی موسم گرما کی ان بارشوں میں 'مینو وا' اور 'کا سا شیما' جنکے معنی بالترتیب 'تنکوں کی برساتی کا حلقہ' اور 'تنکوں کی ٹوپی والا جزیرہ' ہیں۔ یہ نام کتنے حسب حال ہیں اسی کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے درج ذیل نظم لکھی:

کا سا شیما دیپ
گرمی میں ہیں رستے سب
کیچڑ میں لت پت

ہم اس رات 'اِوانُما' (چٹانوں کی دلدل) گاؤں میں ٹھہرے۔

۱۴۔ تاکے کوُما صنوبر

جب میں نے مشہور تاکے کوما صنوبر کو دیکھا تو مجھے آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا کیونکہ یہ درخت بالکل کسی پرانے زمانے کے درخت کی طرح زمین سے اٹھ کر دو جڑواں تنوں میں بٹ گیا تھا ۔ مجھے دسویں صدی عیسوی کے شاعر نو اِن کا خیال آیا۔ مٹسُو صوبہ کے ایک نئے گورنر نے اس درخت کو کٹوا دیا تھا۔ اور دریائے ناتوری پر پل بنانے میں اس کے لٹھوں کو استعمال کیا گیا تھا۔

شاعر نو اِن ۱۵ نے اپنی نظم میں لکھا تھا 'اس صنوبر کا اب یہاں کوئی نشان نہیں ہے'، مگر میں نے سنا ہے کہ یہاں ایک پرانی رسم ہے کہ جب بھی کسی صنوبر کے درخت کو کاٹتے ہیں تو اسی جگہ پر صنوبر کی ایک نئی قلم یا پودا لگا دیتے ہیں۔ یوں اب ایسا لگتا ہے کہ جیسے صنوبر کا یہ درخت ایک ہزار سال سے زندہ ہے۔ یہ ایک نہایت شاندار اور خوبصورت درخت تھا۔

جب میں تو کیو سے رخصت ہوا تھا تو کیوہاکوُ نے یہ نظم میرے لئے الوداعی تحفہ کے طور پر لکھی تھی:

ان کو دکھاؤ
تاکے کُما صنوبر تم
چیری بہارو

میں نے پھر جواب میں درج ذیل نظم اس کے لئے لکھی تھی:

چیری کھلنے سے
دیکھتا ہوں جڑواں صنوبر
تین ماہ کے اندر

۱۵۔ سینڈائی

ہم نے دریائے ناتوری کو عبور کیا اور سینڈائی کے قصبہ میں داخل ہوئے۔ یہ پانچویں قمری مہینے کی چوتھی تاریخ تھی۔ یہ سوسن میلہ سے پہلے کی شام تھی، جب مہکتے ہوئے سوسن کے دستے چھجے کے نیچے اچھی صحت کے شگون کے لئے رکھے جاتے ہیں۔ ہمیں ایک سرائے مل گئی اور ہم نے وہاں کئی روز قیام کیا۔

وہاں کائے مون نامی ایک مصور سے ہماری ملاقات ہوگئی۔ وہ ایک اچھے شاعرانہ ذوق کا حامل تھا اور ہم دوست بن گئے۔ کائے مون نے ہمیں بتایا کہ یہاں قصبہ کے قرب وجوار میں کئی ایسے مقامات ہیں جن کا ذکر شاعری میں ملتا ہے، مگر جن کے نشانات بیشتر معدوم ہو چکے تھے۔ لیکن اس نے بڑی تحقیق وجستجو کے بعد ان کو ڈھونڈ نکالا ہے۔ ایک دن وہ ہمیں ان میں سے چند مقامات دکھانے کے لئے لے گیا۔ میاگی کے جنگل میں جھاڑیوں کا سلسلہ اتنا گھنا تھا کہ میں تصور کرسکتا تھا کہ خزاں میں یہ کتنا حسین ہوگا۔

یہ ایسی رت تھی کہ تماداا، یوکونو اور ازالیا کی پہاڑی پر پھیلی ہوئی سوسن کی جھاڑیوں پر بہار آئی ہوئی تھی۔ راستے میں ہم صنوبر کے ایک ایسے جنگل سے گزرے جو اتنا گھنا تھا کہ سورج کی کرنیں زمین تک پہونچ نہیں پارہی تھیں۔ اس مناسبت سے اس مقام کو کینو شیتا (زیرِ شجر) کہتے ہیں۔ یہاں زمانہ قدیم میں شبنم بھی بہت گرتی ہوگی کیونکہ کہ ایک پرانی نظم میں ہے (یہاں سے گزرتے ہوئے) 'اے ہمسفر سموُ رائی اپنے آقا سے کہو کہ وہ اپنی تنکوں والی ٹوپی پہن لے۔'

شام ہونے سے پہلے ہم طبیبِ روح یاکوشی کے نام سے منسوب ایک مندر، تن وجن فرقہ کی ایک درگاہ اور چند دیگر مقدس مقامات دیکھنے گئے۔ کائی مون نے متسوشیما اور شیوگاما میں مختلف مقامات کے نقشے ہمیں الوداعی تحفہ کے طور پر پیش کئے۔ اس نے ہم میں سے ہر ایک کو گہرے نیلگوں تنکوں سے بنے تسموں والے چپل بھی دیئے۔ اس کے فنکارانہ اور باذوق تحفوں سے ظاہر ہوا کہ وہ واقعی ایک شاعر تھا۔

سوسن پاؤں میں
تسمے ہیں گہرے نیلے
چپل البیلے

۱۷۔ سنگِ تسُوبو

کائے مون کے نقشے کے مطابق سفر کرتے ہوئے پہاڑوں کی کگار سے چمٹی ہوئی ہم ایک ایسی راہگزر پر پہونچ گئے جسے 'اوکُو نوہوسومیچی' (دور شمال [صوبہ] کا تنگ راستہ) کہا جاتا ہے۔

ہم نے وہ علاقہ دیکھا جہاں مشہور توفُو بنانے والی گھاس اگتی ہے۔ جسکا ذکر شاعری میں جابجا ملتا ہے۔ اب بھی اس نرکل سے چٹائی بن کر گاؤں کے لوگ علاقہ کے جاگیردار کو پیش کرتے ہیں۔

سنگِ تسُوبو اِچیکاوا گاؤں میں تاگا قلعہ کے مقام پر جما کھڑا ہے۔ یہ پتھر تقریباً چھ فٹ اونچا اور تین فٹ چوڑا ہے۔ اس پر کائی جمی ہوئی تھی اور اس پر کندہ عبارت کو پڑھنا مشکل تھا۔ صوبائی سرحدوں کے فاصلے دکھانے کے بعد اس کی عبارت کچھ یوں تھی:

یہ قلعہ اونو کے نواب جنرل اَزُوما اُودو نے جن کی دور کے پہلے سال (۷۲۴ء) میں تعمیر کروایا تھا۔ جنرل اَزُوما کو شہنشاہِ جاپان نے شمالی صوبوں کے انصرام کے لئے مقرر کیا تھا۔ بعد میں اس کی مرمت کا کام شمال مشرقی

صوبوں کے گورنر، ایمی کے نواب اور شاہی کونسل کے رکن جنرل اُسا کاری نے ٹمپیو ہو جی دور کے چھٹے سال (۷۶۲ء) میں کرایا۔ چاند کے پانچویں مہینے کی پہلی تاریخ۔

٭جن کی دور شہنشاہِ شومو کے عہد حکومت (۷۲۴ تا ۷۴۹ء) کا حصہ تھا۔

شاعری میں ذکر کردہ بیشتر مقامات کے محل وقوع کا درست پتہ نہیں ہے۔ پہاڑوں سے تودے گرنے کے عمل نے دریاؤں کے راستے بدل دیئے، ان کو نیست و نابود کر دیا اور یادگاروں کو دفن کر دیا۔ پرانے درخت بوڑھے ہو کر گر گئے اور ان کی جگہ نئے درخت نکل آئے۔ زمین کا منظر بدل گیا اور بہت سے مشہور مقامات کی شناخت جاتی رہی۔ لیکن یہاں پر کوئی بھی چیز برباد نہیں ہوئی تھی۔ یہ یادگار ایک ہزار سال قبل بنائی گئی تھی اور ابتک بالکل اصلی حالت میں ہے۔ ماضی کے ساتھ یہ ایک واضح رشتہ کی امین ہے۔ اس کی دید ان چند باتوں میں سے ایک ہے جن سے میرے سفر کی قدر بڑھی۔ یہ میرے مسرور ترین لمحوں میں سے ایک تھا۔ سفر کی ساری تکلیفوں کو بھول کر خوشی سے میرے آنسو نکل آئے۔

۱۷۔ سوُ اِ ے نو مَتسوُ یا ما
(صنوبر کی آخری پہاڑی)

اس کے بعد ہم نے وہ مقامات دیکھے جو شاعری کے حوالے سے مشہور ہوئے تھے۔ مثلاً نو دا میں دریائے تَما اور ایک جھیل کے بیچ میں موجود ایک بڑا پتھر جسے اوکی نو اِاشی یا 'سنگِ ساحل' کہتے ہیں۔ سوئے نو متسو یاما میں صنوبر کی آخری پہاڑی' پر ایک مندر تھا۔ اس کے نام ۱۶ کی لکھاوٹ میں استعمال کردہ چینی کردار (علاماتِ لفظی) وہی تھے جو پہاڑی کے لیے استعمال ہوتے ہیں مگر ان کا تلفظ (پڑھنت) بالکل مختلف (مَتسوزان) تھا۔ صنوبر کے اس جنگل میں سوائے قبروں کے سوا کچھ نہ تھا۔

محبت کرنے والے ہمیشہ ساتھ رہنے کے عہدو پیان کرتے ہیں جیسے ایک پر میں دو پرندے ہوں یا جیسے دو درخت جن کی شاخیں آپس میں ایسی گتھی ہوں کہ الگ نہ کی جا سکیں مگر آخر میں ان سب کا انجام یہی ہوتا ہے۔

یہ سوچ کر میں بحرِغم میں ڈوب گیا اور بہت دیر تک میری یہی کیفیت رہی۔ پھر جب شیوگاما کے ساحل پر میں نے مندر کی گھنٹی کی آواز سنی تو میری یہ اداسی کچھ اور بڑھ گئی۔

مسلسل بارشوں میں ذرا ٹھہراؤ آ گیا تھا۔ ایک دھندلا چاند آسمان پر تھا۔ اور ہم قریب کے ماگاکی جزیرہ کو دیکھ سکتے تھے۔ ماہی گیروں کی چھوٹی کشتیاں ساحل کی طرف آ رہی تھیں۔ شکار کے بٹوارے کے بارے میں ان کی باتوں کی آواز ہم سن سکتے تھے۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ شاعر نے جب 'ساحلی ستونوں سے لپٹی ہوئی رسی کی غمزدہ آواز' لکھا تھا تو اس کے ذہن میں کیا تھا:

میچی نوکو میں
ہر جگہ کا ایک الگ حسن ہے
مگر شی اوگاما میں
جب کشتیاں ساحل پر کھینچی جاتی ہیں
تو حسنِ فسردہ کا ایک حیرت آفریں منظر ہماری آنکھوں کے سامنے کھل جاتا ہے۔

اس رات ہم نے ایک نابینا پجاری کو تنبورہ بجاتے سنا۔ وہ ایک بیانیہ گیت گا رہا تھا جو اس شمالی علاقے کے لئے مخصوص ہے۔ یہ نہ تو ہئی کے سورماؤں کے گیت کی طرح تھا اور نہ کوئی رقص کی دھن والا بلکہ یہ لوک گیتوں کی موسیقی کی طرح بلند آہنگ تھا۔ اور ہمارے سونے کی جگہ سے اتنا قریب تھا کہ ہمیں کافی پرشور محسوس ہوا۔ میں اس بات پر حیران تھا کہ اتنے پرانے گیت اس دور افتادہ علاقہ میں اب بھی گائے جاتے ہیں۔

۱۸۔ شی او گا ما

دوسرے دن ہم صبح صبح شی اوگاما کی درگاہ گئے۔ داتے کے نواب مَساموُ نے اپنی گورنری (صوبائی) کے زمانہ میں اس کی تعمیرنو کی تھی۔ نفیس چوبی ستونوں کا گھیر پر شکوہ تھا۔ اور چھت کے شہتیروں پر چمکتا ہوا رنگ کیا گیا تھا۔ یہ درگاہ پتھر رنگ کی لمبی سڑھیوں کے آخری سرے پر بنی ہوئی تھی۔ اس کے سرخ جھرو کے صبح کی دھوپ میں چمک رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ ہمارے وطن میں یہ بات کتنے کمال کی ہے کہ اس جیسی دور دراز اور کم آباد جگہوں پر بھی خدا کی آسمانی طاقت کے مظاہر جگہ جگہ موجود ہیں۔

اس شِنتو درگاہ کے سامنے ایک پرانی سنگی لال ٹین بنی ہوئی تھی۔ جس کے اطراف دھات کی تیار کردہ جالی پر ''اِزُمی نوسَبوُ رو کی جانب سے بن جی کے تیسرے سال (۱۱۸۷ء) میں عطیہ'' لکھا تھا۔ میں نے سوچا آج سے پانچ سو سال قبل اِزُمی (خاندان) کا سَبوُ رو بہادری، استقامت، وفاداری اور اپنے والدین سے محبت کی صفات کا مجموعہ اور نمونہ تھا آج کوئی بھی ایسا نہیں جو اس نامِ گرامی قدر کا احترام نہ کرتا ہو۔ لوگوں کا یہ کہنا سچ ہے کہ:

جو سیدھے راستے پر چلتا ہے
اور جس کو حق سمجھتا ہے اس پر
قائم رہتا ہے اسے اپنے وقت پر
ضرور عزت ملتی ہے

۱۹۔ متسو شیما

اب دو پہر ہو رہی تھی۔ ہم نے ایک کشتی کرائے پر لی اور صنوبر کے درختوں سے ڈھکے متسو شیما جزیرے کے لئے روانہ ہوئے۔ پانی پر تقریباً پانچ میل کے سفر کے بعد ہم اوجیما کے ساحل پر اترے۔ بہت سے لوگ یہ بات کہتے ہیں مگر یہ سچ ہے کہ متسو شیما واقعی جاپان میں سب سے زیادہ خوبصورت جگہ ہے۔ یہ کسی بھی طرح بھی خوبصورتی میں چین کے حسین ترین مقامات جھیل تنگ تنگ اور جھیل سی سے کم نہیں ہے۔

کوئی سات میل چوڑی، پانی سے کناروں تک لبالب بھری خلیج جنوب مشرق میں سمندر سے مل جاتی ہے چین کے دریائے ژسین ٹینگ کی طرح یہاں بے شمار چھوٹے جزیرے ہیں۔ کچھ لمبے جیسے انگلی آسمان کی طرف اشارہ کر رہی ہو، کچھ لہروں کے سامنے سرنگوں لیٹے ہیں۔ کہیں دو یا تین اکھٹے ہو کر بائیں طرف اپنی شاخیں نکالتے ہیں یا دائیں جانب انگڑائی لیتے نظر آتے ہیں۔ بعض تو ایسے لگتے ہیں کہ جیسے اپنی پیٹھ پر بچوں کو لیے ہوئے ہیں یا اپنے سینے سے بچوں کو چمٹائے ہیں، والدین، دادا، دادی، یا نانا اور نانی کی طرح۔

صنوبر کے درخت شوخی مائل گہرے سبز ہیں۔ ان کی شاخیں سمندر کی نمکین ہواؤں کی وجہ سے ایک قدرتی حسن کے ساتھ جھکی ہوئی ہیں۔ ان میں ایک وقار نمایاں ہے۔ اس خوبصورت عورت کی طرح جس کی اداؤں نے اسے حسین تر بنا دیا ہو۔

کیا یہ جزیرے دیوتاؤں کے عہد قدیم میں پہاڑوں کے دیوتا نے تخلیق کیے ہوں گے! آہ یہ ممکن نہیں کہ کوئی خالق کائنات کے اس حیران کن کارخدائی کے ساتھ اپنے موئے قلم سے انصاف کر سکے یا اپنے الفاظ میں حقیقت کے مطابق بیان کرنے کے بارے میں سوچنے کی جسارت کر سکے۔

اوجیما کا ساحل دراصل بڑے مرکزی جزیرے سے جڑا ہوا ہے اور یوں لگتا ہے کہ جیسے

سمندر کے اندر گھستا چلا جا رہا ہو! وہاں ہم نے زین ماسٹر اُنگو کا حجرہ اور وہ پتھر دیکھا جس پر بیٹھ کر وہ مراقبہ کرتے تھے۔ صنوبر کے درختوں کے بیچ ہم نے وہ خلوت کدے بھی دیکھے جہاں ترک دنیا کرنے والے گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتے تھے۔

اسی طرح کی ایک خانقاہ جہاں سے صنوبر کی جلتی ہوئی کیلوں اور گلوریوں کا دھواں اٹھ رہا تھا ہمیں ایسی پر کشش لگی کہ ہم اس کٹیا کے مالک کے پاس گئے جبکہ اس سے ہماری کوئی شناسائی نہ تھی۔ وہاں ہماری موجودگی کے دوران چاند ابھرا اور پانی پر جلوہ ریز ہوا۔ یہ دن کی روشنی سے بالکل مختلف منظر تھا۔

جب ہم متسوشیما کے ساحل پر واپس آئے تو ہمیں وہاں ایک دومنزلہ سرائے مل گئی جس کی کشادہ کھڑکیاں سمندر کی طرف کھلتی تھیں۔ ہم نے وہ رات 'ہوا اور بادلوں کے ساتھ' گزاری۔ فطرت کا حسن ہمارے چاروں طرف بکھرا ہوا تھا۔ اور ایک انوکھے احساس کا ارتعاش ہمارے اندر تھا۔

متسوشیما دیپ
اے بلبل تو نازک ہے
مانگ لے پر سارس سے

سورا نے یہ نظم لکھی۔ میں نے کچھ نہ لکھا۔ سونے کی کوشش کی۔ نیند نہ آئی۔ جب میں نے اپنی پرانی کٹیا چھوڑی تھی تو اس وقت سودو نے متسوشیما پر چینی زبان میں میرے لئے ایک نظم لکھی تھی اور ہارا اَنتیکی نے مجھے ایک وکا (جاپانی نظم) لکھ کر دی تھی۔ اس کا ایک مصرعہ تھا، 'ساحلوں پر صنوبر والا جزیرہ'۔ میں نے انھیں اپنے سفری تھیلے سے نکالا۔ ان کے علاوہ بھی میرے پاس کچھ ہوکو نظمیں تھیں جنہیں سامپو اور جوکوشی نے میرے لیے لکھا تھا۔

۲۰۔ زُوئی گانجی

چاند کے پانچویں مہینے کی گیارھویں تاریخ کو ہم زُوئی گان جی گئے۔ مکابے کے ہے اِی شیرو نے چین سے واپس آنے کے بعد یہ مندر تعمیر کیا تھا۔ اب اس کا پروہت سلسلہء جانشینی میں بتیسواں (۳۲واں) تھا۔ بعد میں زِین پروہت اُنگو کے کمال اوصاف کے اعتراف اوران کی یاد میں اس کی تعمیرنو کی گئی تھی۔ دیواروں پر سونے کے پتّروں کے ساتھ اس کے چمکتے ہوئے سامانِ تزئین نے اس کو بہشت بدھا کی طرح روشن کیا ہوا تھا۔ لیکن میں اصل میں سنت کیمبُتسو کی وہ چھوٹی سی کٹیا دیکھنے کا آرزومند تھا جو مندر کے ساتھ تھی۔

۲۱۔ اِشی نوماکی

چاند کے پانچویں مہینے کی بارہ تاریخ کو ان راستوں سے جنکے بارے میں ہم نے نظموں میں پڑھا تھا، ہیرائی زومی کی طرف روانہ ہوئے۔ مگر لگتا ہے کہ ان راستوں کو مثلاً اَنے ہانومَتسُو (بڑی بہن والاصنوبر) اوراودائے باشی (تسمہ توڑپل) شکاریوں اور لکڑہاروں کے علاوہ بہت کم لوگ استعمال کرتے تھے۔ ہمیں نہیں معلوم تھا کہ ہم کہاں جارہے ہیں اور ہم راستہ بھول گئے۔ پھر آخرکار ہم ایک ساحلی قصبہ اِشی نوماکی پہنچ گئے۔

دور پانیوں کے اس پار ہم کِن کازان کے جزیرہ کو دیکھ سکتے تھے۔ جس کے بارے میں ایک شاعر نے شہنشاہ کے سامنے بطور تعریف کہا تھا، 'جہاں سونے کے پھول کھلتے ہیں۔'[۱]۔ بندرگاہ پر سینکڑوں کشتیاں ڈول رہی تھیں اور ساحل پر مکان ہی مکان نظر آرہے تھے اور ہر گھر کے باورچی خانہ سے دھواں اٹھ رہا تھا۔

ہم یہاں بالکل اتفاقیہ طور پر پہنچے تھے۔ ہم ٹھہرنے کے لئے کسی جگہ کی تلاش میں تھے مگر ہمیں کوئی سرائے نہ ملی۔ آخر کار ہم نے ایک چھوٹی سی تباہ حال جھونپڑی میں رات گزاری۔ روشنی پھیلتے ہی ہم دوبارہ نکل کھڑے ہوئے انجانے راستوں پر چلتے ہوئے، کئی بار ہم راستہ بھٹک گئے۔ ہم ان مقامات سے گزرتے ہوئے کہ شاعری کے حوالے سے جن کے بارے میں ہم بخوبی واقف تھے جیسے، 'سودے کا آستیں عبور' اتھلا پانی، گھوڑوں کی چراگاہ اوبوجی اور مانو کے اونچی اونچی گھاس کے میدان، ساتھ ہی ان دیگر مقامات کو بھی دیکھتے گئے جنکا ذکر شاعری میں ملتا ہے۔ ہم ایک بے انت پشتہ کے ساتھ ساتھ چلتے رہے جس کا کوئی سرانہیں تھا۔ پھر ہم ڈوبتے ہوئے دل کے ساتھ ایک لمبی اور پتلی دلدل کے کنارے کنارے پگڈنڈی پر آگے بڑھتے رہے۔ وہ رات ہم نے تواِیما کے مقام پر بسر کی۔ اگلے روز آخر کار ہم ہیرائی زُومی پہنچ گئے۔ اس دوران ہم پچاس میل کے قریب چلے ہوں گے۔

۲۲۔ ہیرائی زُومی

فُوجیوارا خاندان کی تین نسلوں کی شان وشوکت کی یاد اب صرف ایک مختصر خواب کی طرح باقی رہ گئی ہے۔ ہدے ہرا کی حویلی سے کوئی ڈھائی میل پہلے ہمیں اس کے عظیم پھاٹک کے کھنڈرات ملے۔ جہاں کبھی اس کی حویلی تھی اب وہاں دھان کے کھیت اور خالی میدان تھا۔ اور وہاں بجز کِن کیئی زاں (سنہری مہوک کی پہاڑی) کے جو کسی زمانہ میں یہاں کی چمن آرائی کا حصہ ہوا کرتی تھی، کچھ بھی نہ تھا۔

ہم یوشِتسونے کے تکاداچی (اونچے قلعہ) تک اوپر چڑھے اور نیچے ہم نے عظیم دریائے کِتاگامی کو بہتے ہوئے دیکھا جو نامبُوصوبہ سے نکلتا ہے۔ ایک معاون دریا 'کورومو' زومی

قلعہ کے گرد بہتا ہوا یہاں قلعے کے نیچے کِتا گامی دریا سے جاملتا ہے۔ یاسوہیرا کا یہ مورچہ دریائے کورومو کی مزاحمتی حد سے آگے تک دیکھتا تھا۔ جنگی لحاظ سے اس کی حیثیت بہت اہم تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شمال سے آنے والے آئینو قبائل کے خلاف نامبُو صوبے کے داخلی راستے کی حفاظت کے لئے اس قلعہ کو ایک دفاعی حکمتِ عملی کے طور پر تعمیر کیا گیا تھا۔

لیکن فوجی شان وشوکت کتنی عارضی ہے۔ یہ بلند بام قلعہ وہی مقام ہے جہاں یوشتسُو نے اور اس کے چنیدہ وفادار جانباز مورچہ بند ہو کر انتہائی بےجگری سے لڑے تھے۔ لیکن ان کے شاندار کارنامے بس ایک لمحے کو باقی رہے اور اب اس جگہ پر بڑی بڑی گھاس اگی ہوئی ہے۔ چینی شاعر تُوفُو نے سچ کہا تھا ۱۸۔

ملکوں کو شکست ہوتی ہے
مگر اس کے دریا اور پہاڑ باقی رہتے ہیں
اور جب بہار کا موسم آتا ہے تو قلعہ کے کھنڈروں میں
گھاس دوبارہ ہری ہو جاتی ہے

ہم اپنی تنکوں والی ٹوپی پر بیٹھ گئے اور خرامِ وقت سے بےخبر دیر تک روتے رہے:

گرمی، گھاس کا ڈھیر
جانبازوں کے نعرے، شور
دُور خواب گزرتے ہیں

ساگون پھول لبھائیں
گئے فوُسا ۱۹ کی زلفیں
یادوں میں لہرائیں
۔سورا

چوُزون جی کے دو مرکزی ہال جنکی کرامات کے بارے میں سنا تھا، عام لوگوں کے دیکھنے کے لئے کھلے ہوئے تھے۔ مندر کے سوترا ہال میں تین عظیم سرحدی جرنیلوں کے مجسمے نصب تھے اور کمرۂ نور میں ان کے تابوتوں کے ناموس کو محفوظ کیا گیا تھا۔ ساتھ ہی وہاں بدھ عقیدے سے وابستہ بہت سی مورتیاں بھی تھیں۔

کمرۂ نور کی چمک دمک والی آرائش شائد بہت عرصہ پہلے ہی مٹ کر ختم ہو چکی ہوگی جواہرات سے مزین کمرے کے جڑاؤ دروازے ہواؤں کے ہاتھوں ٹوٹ چکے تھے۔ ستونوں پر سونے کے پتر پالے اور برف سے تباہ حال تھے۔ خود یہ کمرہ اگر اس کے اطراف نئی تعمیر شدہ چار دیواری اور پھر دھوپ ہوا اور بارش سے بچاؤ کے لئے چھت نہ ہوتی تو یہ گھاس کے خالی میدان کے بیچ اینٹوں اور پتھروں کا ایک ڈھیر تھا۔ اس طرح یہ عمارت شائد کافی عرصہ کے لئے ایک ہزار سالہ یادگار کے طور پر باقی رہ جائے گی:

گرمی کی بارش
چھوڑ گئی اس کمرہ کو
ابتک روشن ہے

۲۳۔ شِنتو مائے نوسِیکی
(گزرتے پانی کی باڑھ)

نامبو جانے والی راہگزر اپنے پیچ وخم کے ساتھ دعوت سفر دیتی ہوئی شمال کی طرف دور تک جاتی دکھائی دیتی تھی۔ لیکن ہم پس وپیش کے ساتھ واپس ہو گئے اور ڈھونڈتے ڈھانڈتے اِواتے کے راستے پر آ گئے۔ وہ رات ہم نے اواتے کے گاؤں میں گزاری۔ اگلے دن شاعری کی زبان میں 'چھوٹی سیاہ چٹانوں کے سلسلے'، 'پانی کا بڑا جزیرہ' اور 'بیچ منجدھار کا جزیرہ' سے گزرتے ہوئے ہم شِنتو مائے نوسیکی (گزرتے پانی کی باڑھ) پر پہنچ گئے۔ شمال کی طرف فرار کے دوران یوشِتسُونے کی بیوی کے ہاں جب ایک بچہ کی ولادت ہوئی تو یہی جگہ تھی جہاں نوزائیدہ بچہ نے پہلی بار پیشاب کیا تھا۔ ہم نرُوکو (طفل گریہ کناں) کے گرم چشمہ سے ہوتے ہوئے یہاں پہنچے تھے۔

پہاڑوں کو عبور کر کے ہم دِیوا کے علاقہ میں داخل ہونے کا منصوبہ رکھتے تھے۔ ہم نے جو راستہ اختیار کیا وہاں لوگوں کی آمد ورفت بہت کم تھی۔ چوکی پر متعین محافظوں نے ہمیں بہت حد تک مشکوک گردانا، پھر بڑی مشکلوں کے بعد (تلاشی اور تفتیش کے بعد) انھوں نے ہمیں آگے جانے کی اجازت دے دی۔ پہاڑوں کے درمیان ہی رات ہو گئی۔ مگر ہمیں ایک سرحدی محافظ کا گھر مل گیا اور ہماری درخواست پر اس نے ہمیں اپنے گھر رات گزارنے کی اجازت دے دی۔ ایک طوفان نے ہم کو وہاں تین دن تک محصور رکھا۔ ہمارا یہ پہاڑی پڑاؤ نہایت تکلیف دہ تھا:

کھٹمل، مچھر، رات
گھوڑوں کے پیشاب کی بو
ہے تکیہ کے پاس

۲۴۔ ناتاگری توگرے
(کلہاڑی شگاف درہ)

ہمارے میزبان نے ہمیں بتایا کہ دیوا صوبہ پہنچنے کے لئے ہمیں ان اونچے پہاڑوں کو عبور کرنا پڑے گا اور راستہ دشوار ہونے کی وجہ سے ہمارے لئے یہ بہتر ہوگا کہ ہم کوئی راہبر اپنے ساتھ لے لیں۔ 'تو ہمیں ایسا ہی کرنا چاہئے'، ہم نے اس کی تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ یوں ہم نے ایک گائڈ کی خدمات حاصل کر لیں۔ ہمارا رہبر ایک مضبوط بدن کا جوان آدمی تھا جس کی پیٹی میں ایک خمیدہ خنجر لگا ہوا تھا اور ہاتھ میں شاہ بلوط کی لکڑی کی لاٹھی تھی۔ وہ ہمارے آگے آگے چل رہا تھا۔ اسکے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے ایک بے چینی کی کیفیت کے ساتھ میں یہ سوچ رہا تھا، 'آج کے دن ہم یقیناً کسی خطرناک صورت حال سے دوچار ہوں گے'۔ ہمارے میزبان نے ہمیں پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا کہ پہاڑ بہت اونچے اور جنگل بہت گھنے ہیں۔ راستہ میں ہم نے کسی ایک چڑیا کا بھی کوئی نغمہ نہیں سنا۔ شاخیں اور پتے ہمارے اوپر اتنے گھنے تھے کہ چلتے میں ایسا لگتا تھا کہ ہم کسی تاریک رات میں سفر کر رہے ہیں۔ مجھے 'ٹوفو' کی نظم یاد آئی:

بکھرے بادلوں سے گرد یوں
نیچے اتر رہی تھی کہ
سورج غبار سے تاریک ہو گیا

بانسواڑیوں کے بیچ سے راستہ بناتے، چشموں کو پھلانگتے، چٹانوں پر لڑکھڑاتے، راستے بھر جسم سے ٹھنڈا پسینہ بہاتے آخرِ کار ہم موگامی ضلع میں داخل ہوئے۔ 'اس راستہ پر کوئی نہ کوئی منحوس حادثہ ہمیشہ ہوتا ہے'، ہمارے گائڈ نے اطمینان کی سانس لیکر رخصت ہوتے ہوئے ہم سے

کہا، 'میں یقیناً خوش نصیب ہوں کہ آپ لوگوں کو یہاں تک بحفاظت لے آیا'۔ تمام راستہ طے ہو جانے کے باوجود ہمارا دل دھک دھک کرنے لگا۔

۲۸۔ اوبانا زاوا
(سرکنڈوں کی وادی)

اوبانازاوا میں ہم ایک صاحب کے گھر گئے۔ ان کا نام سیئی فُوتھا۔ اگرچہ وہ ایک مالدار آدمی تھے مگر بداطوار اور فحش مزاج نہ تھے۔ وہ کیوتو اکثر جاتے رہتے تھے اور انہیں پتہ تھا سفر کسے کہتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اصرار کیا کہ ہم کچھ دن ان کے ساتھ قیام کریں تا کہ اس لمبے سفر کے بعد ہمیں کچھ آرام مل سکے۔ انہوں نے مہمان نوازی کے سارے آداب پورے کیے۔

میں بے فکر ہوا
کمرہ کی ٹھنڈی ہوا
آسائش، آرام

آ جا ہوا میں
چھوڑ دے چکنا ریشم خول
پیارے مینڈک بول

کیسر پھول کو دیکھ
موئے قلم یاد آتا ہے
ابرو بنتے ہیں

جسم پہ ہیں ان کے
پالیس جو ریشم کپڑے
آہ پرانے کپڑے
۔سورا

۲۹۔ پہاڑی کی چوٹی والا مندر

یاما گاتا کے علاقہ میں ایک پہاڑ کی چوٹی پر بدھ مت کا ایک مندر بنا ہوا تھا جسے ریوشکو جی کہتے ہیں۔ ۸۶۰ء میں عظیم پروہت جیکا کو نے اسے خصوصی طور پر ایک پرسکون اور پاکیزہ جگہ پر تعمیر کیا تھا۔ بہت سے لوگوں نے ہم سے کہا کہ اسے دیکھنا چاہئے اگر چہ یہ مندر تقریباً ستر ہ میل کے فاصلے پر تھا۔ مگر اب ہم او بانازاوا سے ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس کے راستے پر آ گئے۔

ابھی تک روشنی باقی تھی۔ ہم نے اپنا سامان پہاڑی کے دامن میں زائرین کے لئے بنی ایک مہماں سرائے میں رکھا پھر پہاڑی کی چوٹی تک چڑھتے ہوئے اس مندر میں گئے پہاڑی اوپر تلے بڑی بڑی چٹانوں سے بنی تھی۔ ان پر شمشاد و صنوبر کے پرانے شاندار درخت کھڑے تھے۔ قدیم چٹانیں اور اطراف کی زمین مخملیں کائی سے ہری ہو رہی تھیں مندر سے ملحقہ عمارتوں اور خانقاہوں کے سب دروازے بند تھے۔ کوئی آواز نہ تھی مگر چوٹی کی کگار پر آہستہ آہستہ قدم رکھتے اور چاروں ہاتھ پاؤں سے چٹانوں پر چڑھ کر آخر کار ہم نے مرکزی بارگاہ مقدس کے سامنے عبادت کی، بے کراں سکوت اور اس منظر کے جمال سے ہمارے دلوں میں گہری پاکیزگی کا احساس اجاگر ہوا:

یہ گہرا سکوت
چٹانوں سے رِستی ہے
جھینگر کی آواز

۳۰۔ او اشیدا
(عظیم چٹانوں کا سلسلہ)

ہم موگامی دریا کے دھارے کے ساتھ ساتھ کشتی کے ذریعے آگے کی طرف جانا چاہتے تھے، اس لئے اچھے موسم کے انتظار میں ہمیں اواشیدا کے مقام پر کئی روز تک ٹھیرنا پڑا۔ ایک زمانہ میں قدیم طرز کی ہائی کائی (سلسلہ بند نظم) شاعری کا بیج یہیں ڈالا گیا تھا۔ اور لوگ اسکی محبت میں یہاں ایسے اسیر ہیں کہ ابتک اسی طرز کی شاعری کرتے ہیں۔ یہ لوگ اس کی بہار کے دن ابھی تک نہیں بھولے ہیں۔ مگر ان کی لحن نرکل کی پچھیری کی طرح دہقانی اور تربیت سے عاری تھی۔ وہ اس شاعری کے راستہ پر ڈگمگاتے ہوئے چل رہے تھے۔ دوراہے پر پس وپیش کرتے کہ کس راستہ پر جائیں، نئے یا پرانے پر۔ انہیں رہنمائی کی ضرورت تھی۔ سو ہم نے سلسلہ بند (Link verse) شاعری/ نظموں کا ایک مجموعہ ان کو دیا۔

کس نے سوچا تھا کہ میں خود اپنی شاعرانہ زیارتوں کے بیچ طرز بشو کو بھی پھیلانے کا کام کروں گا۔

۳۱۔ دریائے موگامی

دریائے موگامی دور شمال کے پہاڑی سلسلوں سے نکلتا ہے۔ بلندیوں کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا یہ یہاں یاماگاتا تک پہنچتا ہے۔ بعض مقامات پر دریا کا دھارا انتہائی خطرناک ہو جاتا ہے مثلاً 'گو کے پتھر' (گو ایک جاپانی کھیل ہے) جہاں چٹانیں اس طرح بکھری ہیں جیسے گو کے بورڈ پر شمار کرنے والی کالی گوٹیں بکھری ہوں اور 'شکاری عقاب' کا مقام جہاں دھارا اتنا تیز ہے جیسے عقاب کی پرواز۔ کوہِ اِتاجیکی کے شمال میں (ایک قدیم نظم میں ذکر ہے) یہ تیز بہتا ہوا دریائے موگامی آخر

میں ساکا تا پر پہنچ کر سمندر میں خالی ہو جاتا ہے۔

دونوں جانب معلق کوہساروں کے درمیان گھنے جنگلوں کے بیچ سے گزرتی ہوئی ہماری کشتی دریا کی لہروں کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی۔ عام طور پر چاول برداری کے لئے استعمال ہونے والی یہ ہماری کشتی 'چاول والی ناؤ' کہلاتی تھی۔ جنگل کے درمیان کھلی جگہ، جہاں سے ہم زرا دور پر شِرا اِتو (سفید دھاگے) آبشار کو دیکھ سکتے تھے۔ ساتھ ہی وہیں سے کچھ فاصلہ پر سِنِد و (کو ہی ساحر کا ایوان) دریا کے کنارے کھڑا نظر آتا تھا۔ دریا بارشوں سے چڑھا ہوا تھا اور ہمارا سفر انتہائی جان جوکھوں کا تھا:

تیز اور لبریز ہے
گرما کی بارشوں سے
موگامی دریا

۴۲۔ ہگوُ روُیاما
(کوہِ سیاہ پر)

چھٹے قمری مہینے کی تیسری تاریخ کو ہم کوہ پیمائی کرتے ہوئے ہگورویاما پر راہبوں کی خانقاہ پہنچے۔ وہاں ہم نے اپنے ایک شاگرد زُوشی ساکیچی سے ملاقات کی۔ اس نے ہمارا تعارف قائم مقام پروہتِ اعلیٰ اِیکا کوُ سے کرایا۔ انھوں نے ہمیں جنوبی وادی کے ایک مندر میں قیام کی دعوت دی۔ اِیکا کو نے ہمارے ساتھ نہایت مہربانی اور بہترین میزبانی کا مظاہرہ کیا۔

چوتھی تاریخ کو مرکزی مندر میں ایک محفل شاعری منعقد ہوئی:

پاکیزہ استھان
برف میں خوشبو بستی ہے
دکھن وادی شان

چھٹے قمری مہینے کی پانچویں تاریخ، ہم نے گون گین درگاہ پر حاضری دی۔ یہ پہلی مقدس عمارت تھی جو کوہ ہگُورو پر تعمیر کی گئی تھی۔ اس کی تصدیق نہ ہو سکی کہ اس کے بانی سنت نو جو کا کون سا زمانہ تھا۔ لیکن دسویں صدی عیسوی کی کتاب تقریبات میں اُشوساتو پہاڑ پر ایک شنتو درگاہ کا ذکر کیا گیا ہے شائد غلطی سے کسی نے 'کالے' کی جگہہ 'گاؤں' لکھ دیا ہے۔ ('کالے' اور 'گاؤں' کے لئے چینی نقوش / کردار کی لکھاوٹ میں تھوڑا ہی سا فرق ہے)۔

میرے لیے یہ تعجب کی بات نہ ہو گی کہ اگر ہگُورو یاما (کوہِ سیاہ پر) اصل میں یہ 'صوبہ سیاہ پہاڑ' رہا ہو گا اور 'صوبہ' کا کردار / نقش، اتفاقیہ طور پر اس میں سے نکل گیا یا مستعمل نہ ہوا۔ جس کی وجہ سے یہ نام صرف 'کوہِ سیاہ' پڑ رہ گیا۔ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ یہ صوبہ دِیوا (پَرادا / ادائیگی) کہلانے لگا کیونکہ ۱۳ءِ کے سرکاری کیفیت زیبنات کے ریکارڈ میں 'پَرون' کو اس کی توصیف و ستائش کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ ہگُورو یاما کا علاقہ گسان (کوہِ قمر) اور یُودونو یاما (کوہِ غسل) کے ساتھ مل کر دیوا سازن (دیوا کے تین مقدس پہاڑ) کی تشکیل کرتا ہے۔

کوہِ ہگُورو پر بنا ہوا یہ مندر رایدو (توکیو) میں توا ےاِی پہاڑی پر تعمیر شدہ کان اے ای جی مندر کے زیرِ انتظام ہے۔ یہ بدھ مت کے تِندائی فرقہ (خدائی بزرگی) سے تعلق رکھتا ہے جس کا مسلک شی کان (ترکِ فکرِ دنیا اور تلاشِ حق) ہے۔ یہ ماہِ کامل کی طرح روشن ہے اور جسکا اندون یُوزو (کاملیت اور بدھ مت قوانین سے ہم آہنگی) کا اصول چراغ ازلی کی طرح آج بھی تابندہ ہے۔

پہاڑی راستوں پر تارک الدنیا اور گوشہ گیر پیروکار قطار در قطار صبر اور سپردگی کے ساتھ ریاضت میں مصروف تھے۔ اس مقدس پہاڑی سے خیر کے پھوٹتے ہوئے سوتے حیرت اور عظمت کا احساس دلاتے ہیں۔ یہ یقیناً شاندار جگہ ہے جو ہمیشہ آباد رہے گی۔

۴۴۔ گسان اور یوُدونویاما
(کوہِ قمر اور کوہِ غسل)

چھٹے قمری مہینے کی آٹھویں تاریخ کو ہم گسان پر گئے۔ ہم گلے میں شہتوت ۲۰ کے کاغذی ہار اور سر پر ڈھلی ہوئی سوتی ٹوپیاں پہنے ہوئے تھے کہ ناپاکی ہم سے دور رہے۔ ہمارا پہاڑی راہبر ایک مضبوط آدمی تھا جو ہم کو بادلوں، کہر، منجمد اور تازہ برف سے گزار کر تقریباً اُنیس میل اوپر تک لے گیا، یہاں تک کے ایسا لگنے لگا کہ ہم سورج اور چاند کے راستے پر جا رہے ہیں۔

جب چوٹی پر پہنچے تو ہم سردی سے کانپنے کے ساتھ بُری طرح ہانپ بھی رہے تھے۔ سورج ڈوب چکا تھا۔ اور چاند نکل آیا تھا۔ ہم نے اپنے لیے گھاس کے بستر اور بانس کی کونپلوں کے تکیے بنائے اور پھر صبح کے انتظار میں لیٹ گئے۔

آخرِ کار سورج طلوع ہوا، بادل ٹکڑوں میں بکھر گئے اور ہم یوُدونویاما کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔

جب ہم وادی کے قریب پہنچے تو ہمارا گزر ایک ایسے گھر کے پاس ہوا جہاں کبھی لوہار کی بھٹی تھی۔ بارھویں صدی میں اس صوبہ کے ایک شمشیر ساز نے اس جگہ کا انتخاب یہاں کے پانی کی فولاد میں لچک پیدا کرنے کی کرشماتی صفت کی بنا پر کیا تھا۔ خواہش دنیا سے اپنے دل و دماغ کو پاک کر کے یہ آہن گر یہاں تلواریں بناتا اور ان پر 'گسان' کندہ کرتا تھا۔ اس کی بنائی ہوئی تلواریں پورے ملک میں نہایت اعلیٰ قدر کی تلواروں میں شمار ہوتی تھیں۔

یہاں مجھے چین میں لُنگ چوآن (ڈریگن چشمہ) میں ٹھنڈی کر کے لچک دی جانے والی تلواروں اور کانچیانگ اور اسکی بیوی مویہ، دونوں کی مشترکہ طور پر ڈھالی گئی اعلیٰ آبدار تلواروں کا خیال آیا۔ مجھے احساس ہوا کہ کسی کام میں کمال حاصل کرنے کے لئے معمول کی محنت سے بہت زیادہ کوشش کی ضرورت ہوتی ہے۔

جب ہم ایک چٹان پر ذرا دم لینے کے لئے بیٹھے تھے تو میں نے قریب ہی چیری کے ایک چھوٹے سے درخت کو دیکھا جو تین فٹ سے زیادہ اونچا نہ تھا۔ اس کے صرف آدھے حصے پر ایک طرف پھول آئے تھے۔ آخر جب بہاران پہاڑوں پر آئی تو سارے جاڑے گہرائی تک برف میں دھنسا، دیر سے کھلنے والا چیری کا یہ خوبصورت درخت پھول کھلانا نہیں بھولا۔ تپتی دھوپ میں آلوچے کی بہار، جیسی زین پہیلی یا بجھاوت کی طرح یہ بھی مہکتا ہوا نمو پاتا رہا۔ یہاں مجھے خانقاہ نشین گیوسون ۲۱ کے درد انگیز مصرعے یاد آتے ہیں:

اے خُودرو چیری کے درخت
میرے علاوہ تمہارا کوئی چاہنے والا نہیں
آہ میرا بھی کوئی نہیں
مگر تو

اس پہاڑ پر چیری کی اس بہار نے مجھے بہت ہی متاثر کیا۔

اب میں اپنے موئے قلم کو ایک طرف رکھتا ہوں کیوں کہ یُودونیاما پر میں نے جو کچھ دیکھا ہے، پہاڑی زائرین کے قواعد وضوابط کے مطابق میں اس کو منکشف نہ کرنے کا پابند ہوں۔

جب ہم جنوبی وادی میں اپنی مندر والی قیام گاہ پہنچے تو اکالیا نے ان تینوں مقدس پہاڑوں کی زیارت سے متعلق میرے تاثرات پوچھے۔ تو میں نے درج ذیل نظمیں شعر لکھنے کی (مروجہ) کاغذی پٹی پر لکھیں:

کتنی ٹھنڈک ہے
ہگُورو کی تاریکی میں
پتلا دھندلا چاند

بادل کے سب دل
بکھرے ہیں دور افق پر
کوہِ قمر پر

یوُدونو کے راز
ہم کہنے سے ان کے باز
آستین پر آنسو

اور سورا نے لکھا:

سکے بکھرے ہیں
یودونو کے رستے پر
پلکوں پر آنسو

۳۴۔ سکا تا

کوہِ ہگوُرو سے رخصت ہو کر ہم ایک سمورائی نا گایاما او جی شیگے کی دعوت پر تسُو رو گا اوکا (سارس پہاڑی) کی قلعہ بستی میں گئے۔ ان کے گھر پر ہم نے چھتیس (۳۶) بندوں پر مشتمل ایک سلسلہ بند نظم لکھی۔ میرا شاگرد زُوشی ساکیچی بھی وہاں موجود تھا۔ جو کوہِ ہگورو سے اتنی دور تک ہمارے ساتھ آیا تھا۔ ہم وہاں سے پھر کشتی کے ذریعے سا کا تا کی بندرگاہ پہنچے جہاں ہم نے طبیب اِین اَین فگ یوکوُ کے گھر قیام کیا۔

چشمے گرم خرام
تیز ہوا، ساحل سے دور
اور خنک ہے شام

لال سورج تپتا
ساگر میں جا کر اترا
موگامی دریا

۳۵۔ کِسا کا تا

بحر و بر کے نہ جانے کتنے مناظر میں نے ابتک دیکھے ہیں مگر اب کِسا کا تا دیکھنے کی توقع کے ساتھ میرا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔ یہ مشہور سمندری جھیل سَکا تا کی بندرگاہ سے کوئی چوبیس (۲۴) میل شمال مشرق میں واقع ہے۔

ہم ساحل کے ساتھ ساتھ ریت کے ٹیلوں سے گزرتے اور پہاڑیوں پر چڑھتے ٹھیک اس وقت اپنی منزل مقصود پر پہنچے جب سورج غروب ہو رہا تھا۔

سمندر سے ایک ایسی ہوا چلی جس نے فضا کو ریت سے بھر دیا۔ پھر بارش شروع ہو گئی اور ہم کوہِ چوکائی بھی نہ دیکھ سکے۔ اندھیرے میں ٹٹول ٹٹول کر چلتے ہوئے ہمارے تصور میں ایک تجسس سے بھرپور کشش یہ تھی کہ کیسا حسین منظر ہمارے اطراف میں بکھرا ہے (جسے ہم نہیں دیکھ پا رہے ہیں) اور اس کے ساتھ ہی بارش کے بعد کا وعدۂ امکانی ایک بہتر و غیر معمولی منظر کے ساتھ ہمارے خیال میں تھا۔ بارش رکنے کے انتظار میں ایک ماہی گیر کے سائبان تلے جس پر سرکنڈوں

کی چھت ڈالی گئی تھی، ہم پناہ گزیں ہوئے۔

اگلی صبح آسمان صاف تھا اور جب سورج اچھی طرح نکل آیا تو ہم ایک کشتی میں جھیل کی سیر کو نکلے۔

نو اِن کے جزیرے سے ہوکر جہاں شاعر پروہت نو اِن نے ترکِ دنیا کے بعد تین سال گوشہ نشینی میں گزارے تھے ہم وہاں سے تھوڑی دور ایک اور جزیرے پر جا کر اترے۔ وہاں ہم نے چیری کا ایک قدیم درخت دیکھا۔ یہ چیری کا وہی درخت تھا جسکے عکس کو پانی میں دیکھ کر سئی گیوٗ نے لکھا تھا:

کسا کا تا میں
چیری کا ایک پیڑ
چڑھتی موجوں میں ڈوبا
پھولوں اوپر کھیتے ہوں گے
کشتی اپنی ماہی گیر

یہ درخت شاعر کی ایک زندہ یادگار ہے۔

جھیل کے ایک کنارے پر ایک شاہی مقبرہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شہنشاہ جنگوٗ (۲۰۱ سے ۲۶۹) کا مدفن ہے۔

وہاں موجود ایک مندر کو 'کان مان جوُ جی' کہا جاتا ہے۔ میں نے کبھی نہیں سنا تھا کہ شہنشاہ (خاتون شہنشاہ) یہاں کبھی آئیں تھیں۔ میں حیران ہوں کہ پھر ان کی تدفین یہاں کیونکر ہوئی۔

ہم مندر میں پروہت کے کمرے میں بیٹھ گئے اور آخر میں جب بانس کی تیلیوں اور زربفت سے بُنی چلمنیں اٹھائی گئیں تو کسا کا تا جھیل کا وسیع وعریض نظارہ ہمارے سامنے آ گیا۔

جنوب میں لگتا تھا کہ گویا کوہِ چوکائی نے آسمان کو اوپر اٹھا رکھا ہے۔ اس کا عکس جھیل میں دکھائی دے رہا تھا۔ مغرب کی جانب کا راستہ اُویا مؤیا رکاوٹ کی وجہ سے بند تھا۔ مگر مشرق کی جانب پشتہ پر بنایا گیا راستہ دور تک اُکتیا صوبہ کی طرف جاتا ہوا نظر آتا تھا۔ شمال میں سمندر پھیلا تھا۔ وہ مقام جہاں سے سمندر جھیل میں داخل ہوتا تھا اسے شی اوگوشی (موج راستہ) کہتے ہیں۔

اگر چہ اس سمندری جھیل کا نام کسا کا تا ہے۔ یہ لمبائی میں دو میل سے کچھ زیادہ اور چوڑائی میں دو میل ہے۔ اسے دیکھ کر مجھے متسوشیما یاد آ گیا۔ لیکن بعض باتوں میں یہ کافی مختلف ہے متسوشیما کا حسن ہنستا ہوا اور سرور انگیز ہے جبکہ کسا کا تا کے چہرے پر ایک اداسی کی پرچھائیں ہے۔ یہاں ایک بے آسرا تنہائی اور غم زدہ روح کی سوگواری تھی:

کسا کا تا کی بارش میں
چھوئی موئی کی جھکی شاخیں، سئی شی ۲۲
دردِ محبت سے ناتواں

موج رستہ بھیگیں
سارس کے لمبے پاؤں
ساگر کی ٹھنڈک

کسا کا تا میں
کیا کھاتے ہیں خاص یہ لوگ
کیا میلہ کا بھوگ

۔ سورا

ایک افلاس زدہ خاندان کی حالتِ زار سے متاثر ہو کر جو سب زمین پر لکڑی کے تختہ پر بیٹھے تھے اور جن کے گھر میں کوئی دالان بھی نہ تھا:

ماہی گیر کا گھر
بیٹھے ہیں اک تختہ پر
شام خنک اثر

تے ای جی ۲۴

سمندر کے کنارے ایک چٹان پر عقابوں کو گھونسلا بناتے دیکھ کر سورا نے کہا:

چٹان پر تمہارا آشیانہ
لِکھا ہے بحر کی موجوں نے کوئی صلح نامہ
سمندر پر بھروسہ! میرے شہباز!

۳۶۔ شمال کا راستہ

سکا تا سے جانے کا دل نہ چاہتا تھا۔ ہم کئی روز تک یہاں ٹھہرے۔ مگر اب میں نے دور ہو کوُرِ کوُ کے افق پر چھائے ہوئے بادلوں کو دیکھا۔ بادل چھٹ گئے لیکن درپیش طویل مسافت کے خیال سے ہمارے دل بیٹھ گئے کہ جب ہم نے سنا کہ کا گا صوبہ کے صدر مقام کا نازاوا کا یہاں سے فاصلہ تین سو میل سے زیادہ ہے۔

نے زو کی سرحدی چوکی سے گزر کر ہم اِچی گو صوبہ میں داخل ہو گئے۔

پھر ہم ایک نئے عزم کے ساتھ آگے بڑھتے گئے اور آخرِ کار ہم اِچو صوبہ میں اِچی بُری

کی سرحدی چوکی پر پہنچ گئے۔ ہمیں اس راستے پر چلتے ہوئے نو (۹) دن گزر چکے تھے۔ سخت گرمی اور بارش میں میری پرانی تکلیف پھر عود کر آئی تھی۔ مگر میں اس کا ذکر نہیں کروں گا:

ساتویں ماہ کا ذکر ۲۴
ہے الگ چھ کی بھی شب
عام سی ہے وہ کب

وحشی سمندر کی جھاگ
سادو کے سینے پر بکھری
جیسے کہکشاں

آج ہم پورے شمالی علاقوں کے سب سے خطرناک مقامات سے گزرے۔ لڑکھڑاتے راستے ہمیں پتھروں کے اس ڈھیر کے اوپر لے گئے جو ایک سپاٹ عمودی چوٹی کے بالکل نیچے تھا اور جس سے اونچی اونچی موجیں ٹکرا رہی تھیں۔ یہاں پر آدمی خود اپنا ذمہ دار تھا۔ ان مقامات کے ناموں سے ظاہر تھا کہ وہ کتنے خطرناک ہیں۔
'والدین کو بھلائیں' ۲۵، 'بچے کو بھلائیں'، 'کتے واپس چلے گئے' اور 'اپنے گھوڑے کو واپس بھیجدو'۔
ہم تھکے ہوئے تھے اور جلد ہی سونے کے لئے لیٹ گئے۔ مگر میں سن سکتا تھا۔ ملحقہ کمرے سے آنے والی آوازیں میرے اندازے کے مطابق دو نوجوان عورتوں کی تھیں۔ پھر ان کی آوازوں کے ساتھ ایک بوڑھے مرد کی آواز بھی شامل ہوگئی تھی۔ میرے خیال میں وہ اِچی گوصوبہ کے ساحلی شہر نی گاتا کے 'نشاط نگر' سے وابستہ خواتین تھیں۔ جو ایک لمبے سفر پر اِی سے کی درگاہ کی زیارت کے لئے جا رہی تھیں۔ بوڑھے آدمی کو اچی بری سرحدی چوکی سے اگلے دِن واپس جانا تھا۔ وہ اپنے گھر والوں کے لئے خط لکھ رہی تھیں تا کہ ان کا رفیق سفر واپس جاتے ہوئے وہ خط اپنے

ساتھ لے جائے۔ ساتھ ہی وہ اپنے جذبات سے لبریز پیغاماتِ زبانی بھی پہنچانے کے لئے اس سے کہہ رہی تھیں۔ جب میں ان کی باتیں سن رہا تھا تو مجھے ان کی سرگوشیوں میں شہرطرب کی ایک قدیم شاعرہ کی ایک نظم کی بازگشت سنائی دے رہی تھی:

جہاں سفید موجوں کی جھاگ
ساحل سے ٹکراتی ہے
ہم ایک ٹوٹی ہوئی ناؤ کے ملبہ کی طرح
یا جیسے بے گھر ملاح
جو ہر رات کسی ہرجائی سے محبت کرتے ہیں
کیا یہی ہمارا انجام کار ہے!
اور یہی ہمارا نصیب!
کہ ہم اس حالت تک گر جائیں
افسوس صد افسوس

میں ان کی باتیں سنتے سنتے سو گیا۔ صبح کو جب ہم وہاں سے رخصت ہو رہے تھے تو ایک نوجوان عورت ہمارے پاس آئی، 'ہمیں راستہ معلوم نہیں'، اس نے کہا، 'ہم یہاں بے سہارا اور خوفزدہ ہیں۔ کیا ایک مقررہ فاصلے سے ہم آپ کے پیچھے پیچھے چل سکتے ہیں'؟ جب وہ بات کر رہی تھی تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا، 'ہم پر اپنی بزرگانہ شفقت اور کرم کیجئے کہ ہم بدھا کی نعمتوں کو محسوس کر سکیں'۔

میں نے جواب دیا، 'مجھے اندیشہ ہے کہ ہم راستے میں اکثر رکتے ہوئے آگے جائیں گے۔ مگر اور لوگ بھی ملیں گے، آپ جن کے پیچھے پیچھے چل سکتیں ہیں۔ اور وہ آپ ہی کے راستہ پر جا رہے ہوں گے۔ خدا آپ کی حفاظت کرے'۔

ان سے رخصت ہونے کے بعد میرا دل رنج و ملال سے بھرا رہا اور میں ان کو دیر تک اپنے ذہن سے نکال نہیں سکا:

اک چھت کے نیچے سوئے تھے
ہم بت کے سنگ مگر
جوں چاند ہو درختوں کے پیچھے کہیں اُدھر

میں نے اپنی یہ نظم سورا کو سنائی اور انھوں نے لکھ لی۔

۴۷۔ ناگو نو اُورا
(ناگو کا ساحل)

کروبے دریا کے ڈیلٹا پر ہم نے 'اڑتالیس سوتوں' اور دیگر چشموں کو اتھلے پانیوں میں پاپیادہ چل کر عبور کیا اور آخرکار ہم ناگو کے ساحل پر پہنچ گئے۔

مان یوشو کے شاعر والے تاکو کے 'ہاتھ ہلاتے ہوئے ویسیڑیا کے پھول' اب یہاں سے زیادہ دور نہیں تھے۔ اگرچہ بہار کا موسم گزر چکا تھا مگر ہم نے سوچا کہ دیکھیں ابتدائے خزاں میں ویسیڑیا کی بیل کیسی لگتی ہے۔ سو ہم نے کسی سے وہاں جانے کا راستہ پوچھا۔
'ساحل کے ساتھ ساتھ یہاں سے کوئی بارہ میل کا فاصلہ ہوگا'، اس آدمی نے بتایا۔'وہ دور پہ۔۔ دیکھئے اُس پہاڑی کے نیچے، لیکن وہاں بہت کم گھر ہیں۔ بس صرف ماہی گیروں کے چند جھونپڑے ہیں۔ وہاں آپ کو رات گزارنے کے لئے کوئی جگہ نہیں ملے گی'۔ اس نے اس اس قدر ہماری حوصلہ شکنی کی کہ ہم سیدھے کاگاصوبہ کو روانہ ہو گئے۔

خوشبو کے ساتھ ساتھ
سیدھے ہاتھ پہ دھان کے کھیت
اَرِیسو کا سمندر

۴۸۔ کا نا زاوا

'ساگوان کے پھولوں والی پہاڑی' اور کوُری کارا کی وادی کو پار کر کے ساتویں قمری مہینے کی پندرہ تاریخ کو ہم کانازاوا کی عظیم قلعہ بستی میں داخل ہوئے۔ اوساکا سے آئے ہوئے ایک تاجر کاشو جو اکثر کانازاوا آیا کرتے تھے، یہاں پہلے سے موجود تھے۔ وہ مل گئے اور سرائے میں ہم لوگ ان کے ساتھ ہو گئے۔

اِشّو ایک معروف نوجوان شاعر تھا۔ اسے سلسلہ بند نظموں (linked verse) کا بہت شوق تھا۔ گزشتہ جاڑے میں اس کا انتقال ہوا تھا۔ اس کے بڑے بھائی نے اسکے لئے ایک یادگاری دعائیہ عبادت کا انعقاد کیا تھا۔ اِشّو میرا شاگرد تھا اور ہم دونوں اکھٹے خزاں کا چاند دیکھنے کے امیدوار و آرزومند تھے۔ میں نے اس کی قبر پر لکھا:

یہ خزاں کی سرد آہیں
مرا دل خراش نوحہ
اے لحد کی خاک مجھ کو کوئی تو جواب دے نا

ہمیں ایک شخص نے اپنی خانقاہ میں آنے کی دعوت دی:

پت جھڑ کی ٹھنڈک
خربوزے اور بینگن سب
چھیل کر ہی کھائیں

راستے میں لکھی گئی ایک نظم:

تپش ہے، آگ ہے سورج، یہ گرمی
خبر کچھ بھی نہیں ہے اس کو جیسے
تغافل دیکھئے بادِ خزاں کا

ایک اور مقام پر جسے 'کوماتسو' یا صنوبرِ صغیر کہتے ہیں:

کتنا حسیں نام ہے یہ میرے مہرباں
چلتی ہوا بھی خوب ہے پیڑوں کے درمیاں
زسل کے ساتھ بکھری ہیں ہاگی کی پتیاں

۳۹۔ تادا کی درگاہ

کوماتسو میں ہم تادا کی درگاہ گئے۔ وہاں ہم نے مشہور جانباز سانے موری (۱۱۱۱ء سے ۱۱۸۳ء) کا خود اور اس کے زرہ بکتر کا ایک حصہ دیکھا۔ کہا جاتا ہے کہ جب سانے موری گینجی خاندان کی خدمت میں تھا تو اس وقت سردار منا موتو کے یوشی موتو نے اسے یہ لباسِ جنگ عطا کیا تھا۔ یہ ایک

غیر معمولی خود تھا۔ یہ چوٹی سے لیکر کانوں کو ڈھانپنے والے حصے تک گل داؤدی کی طلائی نقش کاری سے مزین تھا۔

اس کا نشان ڈریگن کا سر تھا۔ اور خود کی ابھری ہوئی سینگوں پر سونے کا پانی چڑھا تھا۔ ان میں ایک غرور ووقار تھا۔ جب جنگ میں سانے موری مارا گیا تو فاتح کیسو یوشی ناکا نے ہیگوچی کے جیرو کے ہاتھ یہ سامان بھیجا کہ ان باقیات کو درگاہ کی تبرکات میں شامل کرلیا جائے۔ یہ سب کچھ اس درگاہ کے تاریخ نامہ میں واضح طور پر لکھا ہوا ہے:

افسوس، بے ثباتی
ہے زیرِ خودِ جانباز
جھینگر کی آواز

۴۰۔ ناتا۔دیرا

یاماناکا کے گرم چشموں کے راستے میں ہمیں شِرانے (کوہِ سفید) کی چوٹی نظر آرہی تھی۔ یہ پہاڑ سارے راستے ہماری پشت پر تھا۔ ہماری بائیں جانب پہاڑی کے دامن میں ایک مندر تھا جو رحم کی دیوی سے منسوب تھا۔ کہا جاتا ہے کہ شہنشاہ کازان (۱۰۰۸۔۹۶۸) نے جب مغربی صوبوں میں تینتیس (۳۳) مقامات کی زیارت کی تھی تو اس نے سب سے زیادہ مہربان ولیہ اور عظیم محبت والی اس بدھا صفت کا ایک مجسمہ یہاں نصب کیا تھا۔ اس نے اس مندر کو 'ناچی' کے نا اور 'تانی گومی' کے 'تا' کو ملا کر 'ناتا' کا نام دیا۔ یہ اس کے زیارت والے تینتیس (۳۳) مقدس مقامات میں سے اول وآخر کے نام تھے۔

جستجو آفریں اشکال والی چٹانوں پر قدیم گرہ دار صنوبر کے درختوں کی قطار کے ساتھ

ایک چھوٹی سی چھپر چھت عمارت چٹان کی چوٹی پر بنی تھی۔ان چٹانوں کی قدامت کی سفید پاکیزگی نے اس جگہ کو اومی کے مشہور اِشی یاما مندر سے بھی زیادہ حسن سوگوار بنا دیا تھا:

اِشی یاما کے پتھروں
سے زیادہ اجلی چٹانیں ۲۶
خزاں کی ہوا

۴۱۔ یامانا کا کے گرم پانی کے چشمے

ہم یامانا کا کے گرم پانی کے چشموں میں نہائے۔لوگ کہتے ہیں کہ شفا وصحت یابی کے لئے یہ صرف 'اری آکے' کے چشموں کے بعد آتے ہیں:

یامانا کا میں
بہتر گلِ داؤدی سے
چشموں کی خوشبو

ہماری سرائے کا مالک کُوسے نوسُو کے ایک جوان آدمی تھا۔کہتے ہیں کہ اس کے والد کو شاعری کا بہت شوق تھا۔اور یہاں یہ کہانی عام ہے کہ کیوتو کا ایک نوجوان ابھرتا ہوا شاعر اس سرائے کے منتظم کی برتر شاعرانہ ترلیاقت سے اس قدر شرمندہ ہوا کہ جب وہ کیوتو واپس گیا تو اس نے وہاں تے اِی تو کُو (اُس عہد کے ایک معروف شاعر) سے شعر گوئی کا فن سیکھا اور ایک مشہور شاعر بن گیا۔جس کو آج ہم 'تے اِی شِتسو' ۲۷ کے نام سے جانتے ہیں۔جب تے اِی شِتسو کی شہرت دور تک پھیل گئی اور دیگر متعدد شعرا اس کی شاگردی اور تقلید میں اسکے نقشِ قدم پر چل رہے تھے، اس وقت

بھی تے اِی ہِتسو نے اس علاقہ کے باشندوں سے ان کی شاعری پر اپنی رائے دینے یا اصلاح کرنے کا کوئی معاوضہ نہیں لیا۔

سورا پیٹ کی خرابی سے بیمار پڑ گئے۔ چونکہ اِسے کے ایک قصبہ ناگا شیما میں ان کے عزیز رہتے تھے اس لئے ہم نے فیصلہ کیا کہ وہ پہلے چلے جائیں۔ سورا نے درجِ ذیل نظم اپنی رخصت سے قبل لکھی:

رستے میں تنہا
مرجاؤں گر کر، مرجانے دینا
ہاگی کے پھولوں میں کھو جانے دینا

آگے جانے والے کا غم اور پیچھے رہ جانے والے کے رنج کے ساتھ ہم جنگلی بطخوں کے جوڑے کی طرح ایک دوسرے سے جدا ہوئے اور بادلوں میں کھو گئے۔ میں نے لکھا:

آج میں دھودوں گا ۲۸
ٹوپی پر لکھے دو لفظ
آنسو کی شبنم

۴۲۔ زینشوجی

قلعہ بستی دائی شوجی کے مضافات میں زین شوجی نامی ایک مندر میں میں نے رات بسر کی۔ میں ابھی تک کاگا کے علاقہ میں تھا۔ سورا ایک دن قبل یہاں شب گزار کے جا چکے تھے۔ وہ یہاں ایک

نظم رکھ گئے تھے:

میں سنتا رہا
رات بھر بادِ خزاں کو
تنہا پہاڑوں میں

ہم صرف ایک رات کے فاصلے پر تھے لیکن ہزار میل کی دوری لگ رہی تھی۔ میں رات بھر جاگتے ہوئے خزاں کی ہوا کو سنتا رہا۔ صبح کے قریب میں نے پجاریوں کے اشلوک پڑھنے کی آوازیں سنیں پھر ایک گھنٹا بجا اور ہم سب کھانے کے کمرے میں گئے۔

چونکہ میں اسی دن اِچی زِین کے صوبہ پہنچنا چاہتا تھا اس لئے میں وہاں سے فوراً نکلنے کے لئے تیار تھا کہ ایک نوجوان بھکشو زینوں پر میرے پیچھے پیچھے دوڑتا ہوا نیچے آیا۔ اس کے پاس کاغذ اور روشنائی کی ایک ٹکیہ تھی۔ اُسی وقت باغ میں بید مجنوں کے درخت سے کچھ پتیاں زمین پر گر کر بکھر گئیں۔ میں نے لکھا:

آپ کی عنایت کا بدل
کیا باغ میں بید مجنوں کی پتیاں سمیٹ کر
ایک طرف کرنے سے ہوسکتا ہے

میں اپنی تنکوں والی چپل پہلے ہی کس چکا تھا۔ اور میرے پاس فی البدیہہ لکھے گئے اپنے مصرعوں کو پڑھنے کا وقت بھی نہ تھا۔

۴۳۔ اے ای ہے ای جی کا راستہ

ہماری کشتی آبنائے یوشی زاکی کے تنگ دہانے سے گزرتی ہوئی اِیچی زین صوبہ کی سرحد پر ٹھہری۔ ہم شی اوگوشی کے مشہور صنوبر کے درختوں کو دیکھنے کے لئے رکے:

وحشت زدہ تمام رات
طوفانی لہریں اور ہوائیں
ان کے پاؤں کو لرزاں کرتی رہیں
انھوں نے چاند کو اٹھائے رکھا
شی گوشی کے صنوبر
۔سئی گیو

یہاں کے خوبصورت مناظر پر بے شمار نظمیں لکھی گئیں ہیں سئی گیو نے اس نظم میں سب کچھ کہہ دیا۔کوئی بات کہنے کو باقی نہیں رہی۔شی گوشی کے صنوبر کے بارے میں اب کچھ لکھنا ہاتھ میں چھٹی انگلی کا اضافہ کرنے کی کوشش کے مترادف ہوگا۔

مارُواوکا نگر کے مندر تنِ ریو.جی کے بڑے پروہت ان لوگوں میں سے تھے جن سے میری بہت پرانی شناسائی تھی۔تو میں ان سے ملنے گیا۔وہاں ہوکُوشی بھی موجود تھے۔یہ کانازاوا سے ہمارے ساتھ آئے تھے۔اصل میں تو وہ ہمیں تھوڑی دور تک الوداع کہنے کے ارادے سے نکلے تھے۔مگر آخرِ کار وہ ماروادکا تک ہمارے ساتھ ساتھ گئے۔انھوں نے راستے میں آنے والا کوئی بھی قابل دید منظر (خوبصورت) دیکھنے سے نہیں چھوڑا۔وہ راستہ بھر نظمیں لکھتے رہے۔ان کے بعض افکار میں بڑی گہرائی تھی۔وقتِ رخصت میں نے ان کے لئے ایک الوداعی نظم لکھی:

میں، ہمارے میزبان نے بتایا،''اس فرقہ کے بانی کے پہلے جانشین نے یہاں کی تمام گھاس خود کاٹی، مٹی اور پتھر لا کر ارد گرد کی دلدلی زمین کو پاٹ کر خشک کیا تا کہ عقیدمند بغیر کسی زحمت کے آرام کے ساتھ ہمیشہ یہاں آتے رہیں۔ اس کے اس کارنامہ کی یاد کے طور پر آج بھی یہ رسم جاری ہے۔ شِنتو جیشو فرقہ کا زائر پیشوا یہاں مٹی لا کر درگاہ کے آگے پھیلاتا ہے۔ اس تقریب کو 'زائر پیشوا کے مٹی لانے کی رسم' کہا جاتا ہے:

چمکتی ہوئی چاندنی
زائر پیشوا کی لائی ہوئی مٹی پر
کتنی پاکیزہ ہے

قمری مہینے کی پندرھویں کی رات ماہِ کامل کی رات تھی۔ سرائے کے منتظم کے بقول 'ہوسکتی ہے' تو بارش ہوگئی۔

کچھ بھروسا نہیں
آسماں صاف ہو یا نہیں
ابر آئے کہیں

۴۵۔ ارونوہما

آٹھویں قمری مہینے کی سولہویں تاریخ (۳۰ستمبر ۱۶۸۹)، موسم خوشگوار تھا اور میں کچھ چھوٹی گلابی سیپیاں جمع کرنا چاہتا تھا۔ تو ہم نے 'گلابی ساحل' کے لئے ایک کشتی کرائے پر لی۔ ہمیں پانی پر سترہ میل کا سفر درپیش تھا۔ لیکن تن یا نامی ایک شریف و مہربان شخص نے ہماری کشتی میں ناشتہ

کے سامان سے بھرے ہوئے ڈبے اور ساکے (چاول کی جاپانی شراب) سے بھرے بانس کے پیالے رکھ دیئے۔ کئی ملازم ہماری خدمت کے لئے ساتھ کر دیئے۔ موافق ہوا نے دیکھتے ہی دیکھتے ہمیں وہاں پہنچا دیا۔

ساحل پر مچھیروں کی چند جھونپڑیاں تھیں اور بدھ مت کے ہوکّے (نی چی رین) فرقہ کا ایک کم نما سا مندر تھا۔ ہم نے وہاں چائے پی، اپنی ساکے گرم کی (چاول کی یہ جاپانی شراب سرد موسم میں گرم بھی پی جاتی ہے) اور شام کے حسنِ فسردہ کا مزہ لیا:

فسردہ تر اور اس سے بھی سوا
سُوما سے بھی زیادہ تنہا
ساحل پر خزاں

واپس جاتی ہوئی ہر موج
چھوٹی چھوٹی سیپیوں کی قطاریں
اور ہاگی کی بکھری ہوئی پتیاں چھوڑ جاتی ہے

میں نے توسائی سے کہا کہ وہ ہمارے آج کے دن کی مصروفیات مختصر طور پر لکھیں۔ ہم اس روداد کو مندر میں رکھ کر وہاں سے رخصت ہوئے۔

۴۶۔ اوگاکی

میرا ایک شاگرد روتُسُو مجھ سے ملنے تسوراگا آیا تھا۔ ہم دونوں نے مینو صوبہ کا سفر ساتھ ساتھ کیا۔ گھوڑے پر بیٹھ کر ہم 'اوگاکی' کی قلعہ بستی پہنچے۔ اور سوراِای تے سے یہاں پہنچ کر ہمارے ساتھ

شریک ہو گئے۔ اِتسُو جن بھی اپنا گھوڑا دوڑاتے یہاں آ گئے اور ہم سب ایک خانہ نشین سمورائی جوکو کے گھر پہ جمع ہوئے۔

جاگیردار زین سین، سمورائی کے اِی کو، اس کے بیٹے اور دیگر احباب شب و روز مجھ سے ملنے آتے رہے اور یہ سب لوگ ایک ایسی خوشی اور فکر گیری کے ساتھ میرا خیر مقدم کر رہے تھے گویا میں مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہو کر یہاں آیا ہوں۔

گو کہ میں ابتک اپنے سفر کی تھکن اور اس کے اثرات سے پوری طرح باہر نہیں نکلا ہوں مگر اب نویں قمری مہینے کی چھٹی تاریخ (۱۸/۱۰ اکتوبر ۱۶۸۹ء) آ گئی اور میں ۱۳۱ اِی سے کی عظیم درگاہ میں اس تقریب کو دیکھنے کے لئے جانا چاہتا ہوں جو ہر اکیس (۲۱) سال بعد منعقد ہوتی ہے۔ جب مقدس دیوی کو ایک نئی تعمیر کردہ شہہ نشین میں منتقل کرنے کی رسم ادا کی جاتی ہے۔

اب خزاں کے آخری دن ہیں۔ میں ایک بار پھر کشتی کے ذریعے فوُتا می کے سفر پر نکلتا ہوں۔ جہاں کے دو مُنھے گھونگے بڑے لذیذ ہوتے ہیں۔ کشتی پر بیٹھتے ہوئے میں نے لکھا:

جوں خول سے باہر گھونگا
فوتامی کے لئے الوداع
میں چلا اور خزاں بھی

حرفِ آخر

اس پتلی سی کتاب کی عبارت میں آپ کو ایک یگانہ سادگی اور خوبصورتی کے ساتھ باوقار جملے ملیں گے۔ اس تحریر میں مضبوط مردانہ شان کے ساتھ ساتھ نسائی جمال کی نزاکت بھی نظر آئے گی۔

'دور اندرونِ شمال کا تنگ راستہ' کے مطالعہ کے دوران ایسے لمحے آئیں گے جب آپ داد دینے کے لئے کھڑے ہو جائیں گے۔ جبکہ بعض دیگر مقامات پر آپ جذبات میں خامشی سے سر جھکا لیں گے۔

شائد آپ اپنا چٹائی والا برساتی لبادہ پہن کر اسی طرح کے کسی سفر پر نکل جانے کی آرزو کریں یا کبھی آپ چپ چاپ بیٹھنے پر قناعت کرتے ہوئے ان سحر انگیز مناظر میں گم ہو جائیں جو آپ کے ذہن کی آنکھ کے سامنے سے گزرتے جا رہے ہیں۔ یہاں نثر میں ایسے متنوع احساسات ملتے ہیں جو اتنے ہی حسین ہیں جیسے جل پری کے آنسو۔

کیا مسحور کن سفر ہے۔ قلم کاری کا کرشمہ ہے۔ افسوس صد افسوس کہ ایسا با کمال شخص ابروں پر مسلسل بڑھتے ہوئے سفید پالے کے ساتھ اب اسقدر کمزور ہو گیا ہے۔

سَورِیُو۔ گن رد کو عہد کے ساتویں سال۔ ابتدائے موسم گرما (۱۶۹۴)۔ ۳۲

حاشیئے اور تشریحات

۱۔ جاپان میں گڑیوں کا میلہ ہر سال ۳/مارچ کو منعقد ہوتا ہے۔ اس موقع کو بچیوں کی صحت اور انکی خوشیوں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ گڑیوں کو گھر کے اندر کسی طاق یا بکس میں سجایا جاتا ہے۔ اسی زمانے میں آڑو کے پھول کھلتے ہیں۔ جاپان میں یہ موسمِ بہار کا زمانہ ہے۔ باور کیا جاتا ہے کہ بشو نے اپنا گھر جس شخص کو فروخت کیا تھا اسکے گھر میں چھوٹی بچیاں بھی تھیں۔ بشو کا اشارہ اسی جانب ہے۔

۲۔ توکوگاوا ایدو عہد (۱۶۰۳ سے ۱۸۶۸) تک جاپان میں قمری کلینڈر استعمال کیا جاتا تھا۔ ہر شہنشاہ اپنے عہد کا نام خود رکھتے تھے۔ یہی تقویم شہنشاہ کے جشنِ جلوس سے لیکر اس کی حکمرانی کے آخر دن تک چلتی تھی۔ آج بھی جاپان میں شہنشاہ کی تاج پوشی سے اسکے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اور اس دور کا ایک خصوصی نام ہوتا ہے۔ یوں جاپان میں اب بھی عیسوی تقویم کے ساتھ ساتھ ان کے اپنے شاہی دور کی تقویم بھی سرکاری طور پر رائج ہے۔

۳۔ دیوی کونوہنا ساکویا، ہی سے اور نی نی گونو میکوتو (شاہی نسل کے جد امجد) کی ایک شب کی ملاقات کے بعد دیوی حمل سے ہوگئیں مگر میکوتو نے دیوی پر اپنے شک کا اظہار کیا جس پر دیوی نے یہ کہہ کر خود کو آگ کے حوالے کر دیا کہ اگر بچہ سلامت رہا تو وہ حق پر ہوں گی۔ بچہ سلامت رہا۔ بشو نے اسی ہوہودیمی کا ذکر کیا ہے۔

۴۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں مچھلی پکائی جاتی ہے تو اس سے انسانی گوشت کے جلنے کی بو آتی ہے۔

۵۔ ایدو عہد ۱۶۰۳ء سے ۱۸۶۸ء کے بانی توکوگاوا ای یاسو اور ان کے بعد ان کے جانشینوں نے

جاپان کی ترقی، یکجہتی اور استحکام کے لئے عظیم الشان کام کیئے۔ بشو نے یہاں ان تعریف کی ہے۔
۶۔ بشو سے پہلے ان کا تخلص توسیئی تھا وہ متسو او توسیئی کے نام سے لکھتے تھے اور اسی نام سے مشہور تھے۔ مگر جب ٹوکیو میں سومیدا دریا کے کنارے انھوں نے رہائش اختیار کی تو ان کے ایک شاگرد نے انہیں کیلے کا ایک پودا تحفہ میں دیا (۱۶۸۱ء)، جسے ان کے گھر کے آنگن میں لگایا گیا۔ جاپانی زبان میں اس قسم کے کیلے کو بشو یا باشو کہتے ہیں۔ اس زمانے میں جاپان میں یہ پودا بہت کمیاب تھا۔ ان کا گھر بشو والا گھر مشہور ہو گیا اور اسی طرح لوگ بشو کو بھی ماسٹر بشو کہنے لگے۔ یہ پودا بشو کو بہت پسند تھا۔ تو انہوں نے اپنا نام / تخلص توسیئی سے بشو اختیار کر لیا۔ یوں وہ تاریخ میں متسو او بشو ہو گئے۔

۷۔ اعتکاف یا گوشہ گیری بدھ مت کی ریاضت کا ایک عنصر ہے۔ خاص طور پر بھکشوؤں اور مذہبی رہنماؤں کے لئے۔ ویسے تو سال میں نوے (۹۰) دنوں کی گوشہ گیری مقرر ہے۔ یہ سولہ (۱۶) اپریل سے شروع ہوتی ہے۔ بشو نے اسی جانب اشارہ کیا ہے۔
۸۔ جاپان میں بھی دوشیزہ کو پھول سے استعارہ کرتے ہیں ۔ دہری پتیوں کا اشارہ گداز وخوبصورت کی طرف ہے۔

۹۔ این نو گیوجا ساتویں صدی عیسوی میں بدھ مت کے ایک مشہور مبلغ گزرے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے پاؤں میں بہت طاقت تھی، انھوں نے جاپان کے دور دراز شمالی علاقوں تک پیدل سفر کیا تھا۔ بشو ان کے مجسمہ کے سامنے دعا مانگتے ہیں۔

۱۰۔ بوچو (۱۶۴۳ء۔ ۱۷۱۵ء) ایک زین پروہت تھے۔ وہ بشو کے زین استاد اور مرشد تھے۔
۱۱۔ بارھویں صدی عیسوی کے عظیم جاپانی شاعر سئی گیو (۱۱۱۸ء۔ ۱۱۹۰ء)، بشو کے روحانی استاد اور دشتِ سفر میں بشو کے پیشوا تھے۔ بشو ان کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ پروفیسر محمد رئیس علوی نے سئی گیو کے شعری مجموعہ 'سنکشو' سے 'چاند کے چار رنگ' کے نام سے ان کی وکا نظموں کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔
۱۲۔ شرا کاوا شمالی جاپان کی مشہور سرحدی چوکی ہے۔ اس کے اطراف قدرتی حسن اور موسم کے

بدلتے ہوئے رنگوں کے جادو کی بنا پر شعرائے قدیم میں بہت مقبول اور پسندیدہ رہے ہیں۔ درباری لباس پہننے اور ٹوپی کو سیدھا کرنے کا واقعہ بارھویں صدی عیسوی کے ایک تذکرے سے مآخوذ ہے۔

۱۳۔ فوجیوارا نو سانے کا تا، ہیان عہد کے شاعر تھے۔ انھیں 'اوکو' میں جلا وطن کیا گیا تھا۔ وہیں ۹۹۸ء میں ان کا انتقال ہوا تھا۔

۱۴۔ جاپان میں ہر سال پانچویں مہینے کی پانچویں تاریخ کو 'یومِ اطفال' منایا جاتا ہے اس دن جاپان میں قومی تعطیل بھی ہوتی ہے۔

۱۵۔ یہ نو اِن کی نظم سے ہے۔ وہ جب تا کے نما صنوبر کو دوسری بار دیکھنے گئے، تو صنوبر ایک ہزار سال کی عمر کو پہنچ کر ختم ہو گیا تھا۔

۱۶۔ سوئے نومتسو یاما ایک پہاڑ کا نام ہے۔ مندر کا نام مشوجی ہے مگر چینی زبان میں استعمال کردہ کردار دونوں ناموں میں یکساں ہیں۔ گویا لکھاوٹ تو ایک جیسی ہے مگر دونوں کی پڑھنت یا ترکیبِ صوتی مختلف ہے۔ چینی زبان میں لکھے گئے ایک کردار کو کئی طرح سے پڑھا جاتا ہے۔ اور کئی معنی بھی ہو سکتے ہیں۔

۱۷۔ شاعر اوتومونو یاکا موچی، کی یہ نظم 'مان یوشو' سے لی گئی ہے۔ اس دور میں میچی نوکو میں سونا دریافت ہوا تھا۔ نظم میں اسی طرف اشارہ ہے۔

'مان یوشو' جاپان میں نظموں کا قدیم ترین مجموعہ ہے۔ یہ شہنشاہوں کے حکم سے تین سو سال تک مرتب کیا جاتا رہا۔ پھر ۷۵۸ء میں اس کی تکمیل و اشاعت ہوئی۔ پروفیسر محمد رئیس علوی نے 'مان یوشو' سے اردو میں منظوم ترجمہ کیا۔ وائد ولائف فاونڈیشن نے جاپان سے اسے تین جلدوں میں شائع کیا ہے۔ پروفیسر سوزوکی تاکیشی نے اس کی ترتیب و تالیف کا کام انجام دیا تھا۔

۱۸۔ ٹو فو (لی پو) (۷۱۲ء۔ ۷۷۰ء) کے عظیم چینی شاعر۔ انھوں نے اپنی جائے پیدائش ہنیان کی طرف جاتے ہوئے راستے میں انتقال کیا۔ بشو نے ان کی ایک مشہور نظم "جنگ کے زمانے میں بہار کا منظر" سے اشعار لکھے ہیں۔ 'اوکونو' کی تمہید میں بشو نے سفر میں بعض شعرا کی رحلت کا حوالہ دیا

ہے ان میں امکانی طور پر توفو بھی شامل ہیں۔

۱۹۔ کانے فوسا، یوشیتسونے کا کمانڈار تھا۔ اس نے یوشیتسونے کی خودکشی کے بعد اس کی بیوی بچوں کو قتل کر کے عمارت میں آگ لگا دی تھی تا کہ دشمن کو ان کی باقیات کا پتہ نہ چلے۔

۲۰۔ یہاں کے زائروں کے لئے مقررہ لباس۔

۲۱۔ گیوسون پروہت (۱۰۵۵ء۔ ۱۱۳۵ء) اور مشہور شاعر تھے۔

۲۲۔ زی شی چین کی حسین ترین خاتون (چھٹی صدی قبل مسیح)۔ یہ دور چین میں بہار۔ خزاں عہد کہلاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ زی شی کے جمال بے مثال کو دیکھ کر پانی میں تیرتی ہوئی مچھلی بیہوش ہو جاتی تھی۔

۲۳۔ تے ای جی گیفو کے ایک تاجر تھے۔

۲۴۔ ساتویں مہینے کی ساتویں تاریخ (۷ جولائی) کو ہر سال جاپان میں تانا باتا کا تہوار مناتے ہیں۔ جب کہکشاں کو عبور کر کے دو محبت کرنے والے سال میں ایک بار ملتے ہیں۔ اس حوالے سے چھٹی تاریخ کا بھی ایک افسوں ہوتا ہے اور یہ رات بھی دیگر راتوں سے مختلف ہوتی ہے۔

۲۵۔ وہ خطرناک مقامات جہاں سمندر کے کنارے، راستہ پر اونچی اونچی موجیں آتی جاتی تھیں اور وہاں سے گزرنا قسمت آزمائی کا کھیل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان مقامات کو ایسے نام دیئے گئے ہیں۔

۲۶۔ ناتا کے پتھر اشی یاما سے بھی سفید ہیں۔ مگر اصل میں تو اشی یاما کے پتھر سیاہ ہیں۔ یہاں سفید ہونے سے مراد پاکیزگی ہے۔ تاؤازم میں سفید رنگ خزاں کے رنگ کا استعارہ ہے۔

۲۷۔ یاسوہاراتیئی تیتسو (۱۶۱۰ء۔ ۱۶۷۳ء) کا شمار ہائی کائی کے اہم شعرا میں ہوتا ہے۔

۲۸۔ رفیقانِ سفر روائتی طور پر اپنی ٹوپی کے اندر کوئی تشنہ جملہ لکھتے تھے۔ مثلاً 'ہم دوراہی' مگر سورا کے جانے کے بعد جب بشو اکیلے رہ گئے تو انہوں نے وہ جملہ اپنی ٹوپی سے دھو دیا۔

۲۹۔ موسمِ گرما کے اختتام پر پنکھا پھینک دیا جاتا ہے۔ یہ موسم بدلنے کی علامت بھی ہے۔

۳۰۔ گینجی کی داستان ۱۰۲۱ء کے لگ بھگ شاہی محل سے وابستہ خاتون موراساکی شیکی بُو نے تحریر کی تھی۔ اس کا شمار دنیا کے اولین ناولوں میں کیا جاتا ہے۔ موراساکی شیکی بو، شاہزادہ گینجی کی بیوی بھی

تھیں۔

۳۱۔ اِی سے کی درگاہ۔ یہ شنتو شرائن جاپان میں سب سے عظیم، مقدس اور سب سے قدیم درگاہ ہے۔ یہ تین سو سال قبل مسیح اِی سے شہر میں تعمیر کی گئی تھی۔ یہ جاپان کے می اے پریفیکچر کے شہر اِی سے میں دریائے اِسوزو کے کنارے قدیم و کشیدہ قامت سرو شمشاد کے درختوں کے بیچ چھپی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

۳۲۔ وہ ایک جید عالم اور بشو کے دوست تھے۔ سوریوُہی نے اس سفرنامہ کی اشاعت سے قبل اس کی اولین طباعت کے لئے اوکوُنو کے مسودہ کو آخری شکل دی تھی۔

کچھ مصنّف کے بارے میں

پروفیسر محمد رئیس علوی کی پہلی نظم 'حباب' کے عنوان سے لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے پندرہ روزہ رسالے 'آہنگ' میں شائع ہوئی تھی۔ اس وقت رئیس علوی نویں جماعت کے طالب علم تھے۔ انہوں نے ۱۹۶۵ء میں کراچی یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کرنے کے بعد ایک مقامی کالج میں لیکچرار اور پھر پروفیسر کے طور پر کام کیا۔

وہ ٹوکیو یونیورسٹی آف فارن اسٹڈیز میں مہمان پروفیسر رہے۔ جاپان سے واپسی کے بعد پروفیسر رئیس علوی تعلیم کے انتظامی امور سے وابستہ ہوئے:

☆ حکومت سندھ میں ایڈیشنل سیکریٹری تعلیم اور کراچی کی شہری حکومت میں محکمہ تعلیم کے سربراہ رہے۔

☆ کراچی یونیورسٹی کے رجسٹرار کی حیثیت سے کام کیا اور قلندر شہباز یونیورسٹی کے پہلے وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ ان دنوں نیوپورٹ انسٹی ٹیوٹ آف کمیونیکیشن اینڈ اکنامکس کراچی کے ریکٹر کی حیثیت سے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

☆ پروفیسر رئیس علوی کو امریکہ کی پٹس برگ یونیورسٹی کے انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل اسٹڈیز ان ایجوکیشن نے ۲۰۰۱ء میں فیلوشپ کی تکمیلی سند پر ان کی علمی حیثیت کے اعتراف میں ایک بے مثال اقدام کے تحت انھیں 'ڈاکٹر' کے اعزاز سے نوازا۔

☆ ۲۰۰۷ء میں ہندوستان میں ہندی اردو ساہتیہ اوارڈ کمیٹی یوپی (انڈیا) نے اردو زبان کی

خدمات کے اعتراف میں انھیں ادبی ایوارڈ عطا کیا۔ فیض احمد فیض کے بعد پروفیسر علوی دوسرے پاکستانی ہیں جنھیں یہ ایوارڈ دیا گیا۔

☆ جاپان میں زیر اشاعت جاپانی اردو لغت کے مسودے پر نظر ثانی کا کام کیا۔ ان کی پانچ کتابیں جاپان سے شائع ہو چکی ہیں۔

☆ آسٹریلیا (۱۲/۲۰۱۱ء میں) کے شہر سڈنی اور ملبورن میں اردو زبان وادب کے موضوعات سے متعلق مختلف فورمز پر خطاب کیا۔

☆ نیوزی لینڈ میں اردو زبان وادب کے فروغ کے لیے اردو ہندی کلچرل ایسوسی ایشن آف نیوزی لینڈ کا خاکہ پیش کیا اور ۲۰۱۰ء میں ایسوسی ایشن کے قیام کے بعد اسکے سرپرست اعلیٰ مقرر ہوئے۔

پروفیسر رئیس علوی ادبی و تعلیمی موضوعات پر متعدد کتابوں و مضامین کے مصنف و مترجم ہیں۔ ان کی نثر میں شگفتگی کے ساتھ گہرائی ہے۔ ان کی شاعری میں استعارے کی صورت آفرینی کے ساتھ ہمارے عہد کی خانہ بدوش زندگی کا اضطراب ہے۔

پروفیسر محمد رئیس علوی کی دیگر تصنیفات:

گل صد برگ۔ جلد اول (۱۹۸۹)	جاپان کے قدیم ترین شعری مجموعہ
گل صد برگ۔ جلد دوم (۱۹۹۱)	'منیوشو' سے وکا نظموں کا منظوم اردو ترجمہ
گل صد برگ۔ جلد سوئم (۱۹۹۴)	ترتیب وتالیف پروفیسر سوزوکی تاکے شی۔ وائلڈ لائف فاؤنڈیشن جاپان
چاند کے چار رنگ	بارھویں صدی عیسوی کے عظیم شاعر سئی گیو کے مجموعہ 'سنکشو' سے وکا نظموں کا منظوم اردو ترجمہ۔ کراچی
صدا ابھرتی ہے	شعری مجموعہ (نظمیں وغزلیں)۔ مکتبہ دانیال کراچی
جاپانی اردو بول چال	پروفیسر سوزوکی تاکیشی و پروفیسر محمد رئیس علوی۔ دائی گاکوشورن ٹوکیو
غزل اے نواز انائی	پروفیسر محمد رئیس علوی۔ ترتیب وتالیف رنگوا ٹوموتو۔ ٹوکیو۔ (غزل نامہ۔ جاپانی زبان)
الفتِ دامِ رہگزر	شعری مجموعہ (زیر ترتیب)